مولانا مفتی محمد زاہد☆

تدریس حدیث اور عصر حاضر کے تقاضے

[۱۵ فروری ۲۰۰۹ء کو الشریعہ اکادمی میں ''عصر حاضر میں تدریس حدیث کے تقاضے'' کے موضوع پر منعقدہ سیمینار کے لیے لکھا گیا]

میں جناب مولانا زاہد الراشدی صاحب اور الشریعہ اکادمی کی پوری ٹیم کو ''تدریسِ حدیث اور عصرِ حاضر کے تقاضے'' جیسے اہم عنوان پر اس سیمینار کے انعقاد پر مبارک باد پیش کرتا ہوں اور ان کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے نہ صرف مجھے اس علمی مجلس میں شرکت کر کے اس سے مستفید ہونے کا موقع فراہم کیا بلکہ اپنی طالب علمانہ گزارشات پیش کرنے کا اعزاز بھی بخشا۔

ہمارا یقین ہے کہ اسلامی تعلیمات میں ہر دور کے انسانوں کی راہ نمائی کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ کسی بھی دور میں اس صلاحیت کی عملی شکلیں دریافت کرنے کے لیے اسلامی احکام کے دوسرے بنیادی اور قرآن سے زیادہ مفصل سرچشمے ''حدیث وسنت'' کے درست مطالعے کی ضرورت ناقابلِ انکار ہے۔ زمانے کے تقاضوں سے عہدہ برآئی کے سلسلے میں مطالعۂ حدیث کی اہمیت کا شاید سب سے پہلے بھرپور ادراک ہمارے برصغیر ہی کی ایک نامور علمی شخصیت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے کیا۔ ان کی نظرِ بصیرت نے یہ بھانپ لیا کہ آنے والے دور کے پڑھے لکھے اور سوچنے سمجھنے والے لوگوں کو تفہیمِ دین کے لیے ضروری ہے کہ احکامِ دینیہ میں پائے جانے والے اسرار، حکم اور مصالح کو دریافت کر کے نہ صرف جزوی طور پر ہر ہر حکم کی عقلی حکمت اور عملی مصلحت کو واضح کیا جائے بلکہ ان حکمتوں اور مصلحتوں کا ایک نظامیاتی (Systemetic) مطالعہ کیا جائے جس سے یہ نظر آئے کہ پوری شریعت کی ایک روح ہے جو بدن کے مختلف اعضا کی طرح ہر ہر حکمِ شرعی میں موجود ہے۔ بظاہر احکامِ شرعیہ کی سب سے منضبط، مدوّن اور مفصّل شکل فقہ کی کتابوں میں ملتی ہے۔ شاہ صاحبؒ نے مذکورہ ضرورت کا احساس کرتے ہوئے ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کی شکل میں جو عظیم کام سرانجام دیا، اس کے بارے میں یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ اس کی بنیاد فقہِ اسلامی پر اٹھائی جائے گی، مگر شاہ صاحب نے ایسا نہیں کیا، بلکہ حجۃ اللہ البالغہ کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ یہ کتاب، خاص طور پر اس کی ''القسم الثانی'' حدیث پر مبنی ہے اور شاہ صاحب نے عموماً ''مشکاۃ المصابیح'' کی ترتیب کو اپنایا ہے اور احکامِ شرعیہ کی جزوی حکمتیں بیان کرنے کے لیے مشکوٰۃ ہی کی احادیث کو بنیاد بنایا ہے جو آج کی طرح اُس زمانے میں بھی برّصغیر میں حدیث کی اہم نصابی کتاب تھی۔

آج امتِ مسلمہ تہذیبی اور فکری اعتبار سے جن چیلنجز کا سامنا کر رہی ہے، ان کی صورتِ حال بہت حد تک دوسری

☆استاذ حدیث، جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد۔ zahidimdadia@yahoo.com

اور تیسری صدی ہجری کے حالات کے مشابہ ہے، صرف اس فرق کے ساتھ کہ اس وقت مسلمان سیاسی طور پر فاتح، بالاتر اور غالب قوم تھے جبکہ آج معاملہ برعکس ہے۔ وہ دور بھی ایسا تھا جس میں دیگر اقوام کے علوم وفنون عربی زبان میں منتقل ہو کر اپنے اثرات مرتب کر رہے تھے، اور ان علوم وفنون کے ساتھ کیا طرزِ عمل اختیار کیا جانا چاہیے، یہ امر موضوعِ بحث بنا ہوا تھا۔ دنیا کی مختلف ثقافتوں اور تہذیبوں کے دھارے مسلمان معاشروں میں شامل ہو کر زندگی کو ایک نئی شکل دے رہے تھے، ایک متنوع معاشرے کی بنیاد رکھ رہے تھے اور ساتھ ساتھ بہت سے عملی اور فکری سوال پیدا کر رہے تھے۔ یہی دو صدیاں فقہ وحدیث کی تدوین کے نقطۂ عروج کی صدیاں ہیں۔ اس کے بعد کی صدیاں -سوائے چند استثناءات کے- اسی کام کی خوشہ چینی، اس پر تقعید وتفریع، اس کی تشریح یا اسے سہل التداول بنانے کا دور ہے۔ ہمارے ہاں فقہ اور حدیث دونوں کے معاملے میں علم اور ذہنی ساخت کے بنیادی سرچشمے اسی مؤخر دور کے ہیں۔ مثال کے طور پر ائمۂ مجتہدین نے اپنے اصولِ اجتہاد کی از خود وضاحت بہت کم فرمائی، اس مؤخر دور میں یہ ہوا کہ ان ائمہ کے اجتہادات کا مطالعہ کر کے جو اصول ان میں کارفرما نظر آئے، انہیں مرتب ومدوّن کر دیا گیا۔ یہی حال حدیث کا ہے۔ امام بخاری، امام مسلم، امام ترمذی جیسی شخصیات سے حدیث کے ردّ وقبول کے جو اصول صراحتاً نقل ہوئے ہیں، انہیں شاید انگلیوں پر گنا جا سکے۔ ''مصطلح الحدیث'' کے نام سے جو سرمایہ ہمارے پاس موجود ہے، وہ بنیادی طور پر حاکم، خطیب بغدادی اور ابن الصلاح جیسی شخصیات کی عطا اور ان کی سعیِ مشکور کا نتیجہ ہے۔ فقہ وحدیث دونوں کے حوالے سے ان مؤخر ادوار کا کام قابلِ قدر بھی ہے اور قابلِ استفادہ بھی۔ اس سے استغنا کو مجذوب کی بڑ ہی کہا جا سکتا ہے، لیکن یہ دور بہر حال ابتدائی چند صدیوں کے مقابلے میں ٹھہراؤ اور ''ٹک ٹکا'' کا تھا۔ یہ چیز اس لحاظ سے مؤخر دور کے کام کی اہمیت کو بڑھا دیتی ہے کہ اس میں اطمینان کے ساتھ پچھلے دور کی فصل سمیٹنے بلکہ اسے صاف کر کے پیک کرنے کا موقع مل گیا، لیکن ہمیں جس دور کا سامنا ہے، وہ دوبارہ ابتدائی صدیوں کے مشابہ بلکہ تبدیلیوں کے انفجار اور explosion کا دور ہے۔ اس میں کافی حد تک ابتدائی صدیوں سے ملتے جلتے چیلنجز کا سامنا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ ان کے پاس قرآن وسنت اور متفرق آثارِ صحابہ وتابعین کی شکل میں صرف خام مال ہی تھا، ہمارے زمانے میں تیار شدہ مال بھی وافر اور پورے تنوع کے ساتھ موجود ہے، نیز اس فرق کے ساتھ کہ اس دور کے اہلِ علم کو زمانِ نبوت کے قرب اور اس کے ماحول سے ایک گونہ واقفیت کا جو فائدہ حاصل تھا، وہ آج کے دور کے لوگوں کو حاصل نہیں۔ آج کے دور میں صرف چند جزوی سوالات ومسائل ہی پیدا نہیں ہوئے بلکہ بعض بنیادی نوعیت کے اصولی سوالات بھی اس دور نے کھڑے کر دیے ہیں۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ فقہ وحدیث دونوں کے اندر مؤخر دور کی کاوشوں سے استفادے کے ساتھ ساتھ ہمیں اس دور میں بھی جانا ہوگا جس کے ساتھ ہمارے زمانے کی مشابہت ہے۔ یہ کام خاصا مشکل ہے، اس لیے کہ مؤخر دور کا کام پکی پکائی روٹی کی طرح ہے، جبکہ ابتدائی قرون کی محنت وکاوش سے استفادے اور اس دور میں جا کر کام کے لیے بڑی عرق ریزی، علمی گہرائی اور خاص قسم کی پختگی اور رسوخ کی ضرورت ہے، اس لیے کسی نظامِ تعلیم کے ذریعے سب کو تو ظاہر ہے، اس معیار پر نہیں لایا جا سکتا، لیکن جب بھی ہم اپنے نظامِ تعلیم یا طرز ہائے تدریس پر بات کریں تو ہمارے پیش نظر یہ بات بہر حال رہنی چاہیے کہ کچھ باصلاحیت افراد ہم ایسے ضرور تیار کر لیں جو اپنی علمی زندگی کے پختگی کے مرحلے پر جا کر ضرور اس قابل ہو سکیں کہ ان کا کام محض متوسط اور آخری دور کے ذخیرہ کے فہم، اس کی تشریح اور اس کے انطباق تک محدود نہ ہو بلکہ اس سے اوپر اٹھ کر اور پیچھے جا

کر اصولی اور بنیادی نوعیت کے پیدا ہونے والے سوالات کے سلسلے میں جو کرنے کے کام ہیں، وہ کر سکیں۔ یہ کام نازک ضرور ہے، اس میں خدشات کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن کوئی بھی ضروری کام ایسا نہیں ہے جو کسی قدر خطرات مول لیے بغیر ہو سکتا ہو۔ باقی اللہ تعالیٰ نے امت کے اجتماعی ضمیر میں انٹی وائرس رکھے ہوئے ہیں جو اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔

حدیث کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے تمہید میں یہ باتیں اس لیے عرض کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ہمارے ہاں جس طرح فقہ میں بدائع اور سرخسی تو دور کی بات ہے، عالمگیریہ اور شامی سے اوپر جانے کی بعض اوقات ضرورت محسوس نہیں کی جاتی، اسی طرح بعض لوگ علوم الحدیث سے متعلق بھی حاکم، خطیب اور ابن الصلاح وغیرہ کو ہی اس میدان کی کل دنیا سمجھ بیٹھے ہیں، حتیٰ کہ اس بارے میں وہ حضرات بھی مستثنیٰ نظر نہیں آتے جو عام حالات میں تقلیدی رویوں کو ناپسند کرتے ہیں، حالانکہ بڑے بڑے محدثین کے تصحیح وتضعیف کے سلسلے میں ایسے اقوال مل جاتے ہیں جو مذکور الصدر حضرات کے مرتب کردہ اصولوں پر پورا اترتے نظر نہیں آتے۔ مقصد خدانخواستہ کسی ایسے طرزِ عمل کی دعوت دینا نہیں ہے جو علمی اور فکری انارکی کا راستہ کھول دے۔ دینی علوم کے ہر شعبے میں تجربات کی بنیاد پر جو ڈسپلن قائم ہیں، انہیں اپنے دائرے میں قائم رہنا چاہیے، لیکن ایک دائرہ ایسا بھی ہونا ضروری ہے جہاں مذکور الصدر ضرورت کی تکمیل ہو۔ دراصل ضرورت ایجاد کی ماں ہے، ضرورت کا کام اگر اہل لوگوں کے ہاتھوں انجام نہ پائے تو نااہلوں کے ہاتھ چڑھ جاتا ہے۔

عصرِ حاضر کے تقاضوں کی تکمیل میں حدیث کے کردار کو مؤثر طور پر بروئے کار لانے کے لیے جو بھی حکمتِ عملی وضع کی جائے گی، اس میں تدریس کا پہلو نمایاں اہمیت کا حامل ہوگا، اس لیے کہ کسی بھی منصوبے کی تکمیل اور کسی حکمتِ عملی سے مطلوبہ نتائج اخذ کرنے کے لیے رجالِ کار کا وجود ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے، اور رجالِ کار کی تیاری میں تدریس اور طریقہ ہائے تدریس بنیادی عنصر ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں دینی مدارس کے نصاب پر تو کافی بحث ہوتی ہے، تدریس پر بات نسبتاً کم ہوتی ہے۔ آج کی مجلس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تدریس کو بنیادی موضوع بنایا گیا ہے۔ اپنی گفتگو کو مرکوز رکھنے کی خاطر یہاں صرف دینی مدارس وجامعات میں ''تدریس حدیث'' کی بات کی جائے گی، اس لیے کہ عصری جامعات کے مقابلے میں ان مدارس کی تدریسِ حدیث مواد کی مقدار، تدریس میں گہرائی اور دین کے اصل مصادر سے استفادے کے لیے درکار بنیادی صلاحیت جیسی خصوصیات کی وجہ سے امتیازی حیثیت رکھتی ہے، اس لیے اس میں بہتری پیدا کرنے کے نتائج بھی زیادہ مؤثر اور بہتر ہو سکتے ہیں۔ دینی مدارس میں ''تدریس حدیث'' سے ہماری مراد صرف دورۂ حدیث کی تدریس نہیں ہے، بلکہ بالکل ابتدائی درجات سے لے کر تخصص فی الحدیث تک تمام درجات میں تدریس ہمارے موضوعِ بحث سے متعلق ہے، اس لیے اس گفتگو میں بعض ایسے تحقیقی کاموں کا بھی تذکرہ آ جائے گا جن کی اس زمانے میں ضرورت ہے۔

﴿۱﴾

علمِ حدیث ایک بڑا وسیع کینوس رکھنے والا علم ہے جس کی کوکھ سے کئی مستقل علوم نے جنم لیا ہے اور اس میں وسعت اور پھیلاؤ کے بے شمار امکانات موجود ہیں، لیکن ہمارے ہاں اندازِ تدریس کے بعض پہلو ایسے ہیں جن کی وجہ سے علمِ حدیث کی وسعت، گہرائی اور اس کے امکانات طالب علم پر واضح نہیں ہو پاتے جس کی وجہ سے تحصیلِ علم سے فراغت کے بعد کی زندگی میں بھی وہ اس مبارک علم میں قابلِ ذکر کام سر انجام نہیں دے پاتا۔ طرزِ تدریس کی ان خامیوں میں پہلی چیز یہ ہے کہ ہمارے ہاں عموماً درسِ حدیث کا بیشتر حصہ اور پڑھانے والے کا زیادہ زور یا تو فقہی احادیث پر صرف ہوتا ہے یا ان چند کلامی

مباحث پر جو ایک تو ہمارے دور میں مردہ ہو چکی ہیں اور ان کی جگہ کئی نئی تازہ بحثوں نے لے لی ہے۔ دوسرے ان میں اختلاف بھی عموماً لفظی ہوتا ہے۔ اس طرح سے حدیث کا یہ درس عملاً کچھ علمِ کلام اور کچھ الفقہ المقارن کا درس بن کر رہ جاتا ہے۔ پھر احادیثِ احکام میں بھی توجہ کا محور عبادات وغیرہ کے چند مسائل ہی رہتے ہیں۔ احادیثِ احکام کا بڑا حصہ جو معاملات، سماجیات، سیاسیات، قانون، بین الاقوامی تعلقات وغیرہ سے متعلق ہے، وہ توجہ کا مستحق نہیں بن پاتا۔ بعض اوقات نسبتاً کم اہمیت رکھنے والے مسئلے پر ضرورت سے کہیں زیادہ وقت صرف کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر بعض اوقات قضاے حاجت کے دوران استقبال واستدبارِ قبلہ کے مسئلے پر استاذ کے کئی کئی دن صرف ہو جاتے ہیں، حالانکہ اسی میں سے کچھ وقت بچا کر اسے اس سے اہم کسی مسئلے پر صرف کیا جا سکتا تھا۔ پھر گفتگو کا انداز بھی کچھ ایسا ہوتا ہے جس سے محسوس ہوتا ہے کہ حنفی، شافعی (مثلاً) دو مد مقابل پارٹیاں برسرِ پیکار ہیں۔ اس کے نتیجے میں طالب علم کے اندر بحث وتحقیق کا صحت مند رجحان پروان چڑھنے اور علمی منہجِ تحقیق کا نمونہ سامنے آنے کی بجائے اس کی شخصیت میں مناظرانہ انداز کے ایسے بیج بو دیے جاتے ہیں جو بعض اوقات زندگی بھر اس کا ساتھ نہیں چھوڑتے، اور اس سے طالب علم کی علمی شخصیت ہمیشہ کے لیے تباہ ہو جاتی ہے یا کم افادیت کی حامل رہ جاتی ہے، حالانکہ جن ائمہ اور بزرگوں کی تائید یا اتباع میں بظاہر ایسا کیا جاتا ہے، خود ان کا اپنا طرزِ عمل یہ نہیں تھا۔ ان ائمہ کی بات تو بہت دور کی ہے، ماضی قریب کی معروف علمی شخصیت شیخ الہند مولانا محمود حسن کا جو طرزِ عمل ان کے شاگرد مولانا مناظر احسن گیلانی نے اپنی چشم دید گواہی کی بنیاد پر لکھا ہے، وہ قابل توجہ ہے۔ یہ بات تو اہلِ علم جانتے ہی ہیں کہ مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا یعقوب نانوتوی اور شیخ الہند مولانا محمود حسن وغیرہ کے درس حدیث میں اس طرح سے تقریریں نہیں ہوتی تھیں جیسے آج کل ہوتی ہیں۔ یہ سلسلہ علامہ انور شاہ کشمیریؒ سے شروع ہوا۔ شاہ صاحب علم کا بحر زخار تھے، جو موضوع چل پڑتا، اس پر علم کا بند کھل جاتا۔ بعد میں ہم جیسے لوگوں نے یہی کام بتکلف شروع کر دیا۔

بہر حال اسی سلسلے میں مولانا مناظر احسن گیلانیؒ شیخ الہند کا یہی طرزِ اختصار نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''جب کوئی ایسی حدیث آجاتی جو بظاہر مفہوم کے لحاظ سے قطعی طور پر حنفی مذہب کے خلاف ہوتی اور پڑھنے والا طالب علم خود رک کر دریافت کرتا یا دوسرے طلبہ پوچھتے ''حضرت یہ حدیث تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قطعاً خلاف ہے'' جواب میں مسکراتے ہوئے بے ساختہ شیخ الہندؒ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلتے: ''خلاف تو ہے بھائی! میں کیا کروں؟ ہاں آگے چلیے۔'' (مولانا مناظر احسن گیلانی: ص ۱۱۸، مکتبہ عمر فاروق کراچی)

بظاہر کہنے کا مقصد یہ تھا کہ یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔ اجتہادی اختلافی مسائل میں تو ایسا ہوتا ہی ہے کہ ہر فریق کے پاس کوئی نہ کوئی دلیل ہوتی ہے اور ہر فریق کی دلیل بظاہر دوسرے فریق کے خلاف ہوتی ہے، اس لیے ایسے مسائل میں یہ توقع رکھنا کہ ہمارے خلاف کوئی دلیل نہ ہو، کا مطلب یہ بنتا ہے کہ دلیل صرف ہمارے پاس ہو، دوسرے فریق کے پاس نہ ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو اس مسئلے میں اختلاف ہی کیوں ہوتا۔

تدریس کا یہ طرزِ عمل جو حدیث کے لیے مختص وقت اور صلاحیتوں کا بڑا حصہ چوس جاتا ہے، درحقیقت درس گاہ سے باہر کے بعض عوامل کا نتیجہ ہے۔ اصل معرکہ کہیں اور بپا ہوتا ہے، لیکن ہر فریق کی درس گاہیں اس معرکے کے لیے اسلحہ ساز فیکٹریاں اور فوجی ٹریننگ کے ادارے بن جاتے ہیں۔ ہوا یوں ہے کہ عہد رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد متعدد علاقوں میں جا کر کبارِ صحابہ اور فقہاے صحابہ میں سے بڑی شخصیات آباد ہو گئیں جنہوں نے وہاں عملی طور پر بھی لوگوں کو دین سکھایا جیسا کہ انہوں نے

حضورِاقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھا تھا اور علمی طور پر بھی بہت سے شاگرد تیار کیے جن سے آگے فیض پھیلا۔ ان فیض یافتگاں میں بڑے بڑے فقہا بھی شامل تھے۔ یوں مصر، شام، عراق اور حجاز وغیرہ میں دین پر عمل کی مختلف شکلیں رائج ہوگئیں اور تعلیم وتعلّم کے مستقل سلسلے قائم ہوگئے۔ بنیادی طور پر یہی چیز آگے چل کر اختلافاتِ فقہا کی ایک اہم بنیاد بنی۔ دین پر عمل اور فقہی آرا میں یہ تنوّع حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور تک کھل کر سامنے آچکا تھا۔ صدیق اکبرؓ کے پوتے قاسم بن محمدؒ نے جب اس تمنا کا اظہار کیا کہ کاش یہ اختلاف نہ ہوتا تو عمر بن عبدالعزیزؒ نے انہیں ٹوکتے ہوئے فرمایا کہ مجھے سرخ اونٹوں کا لالچ دیا جائے، تب بھی میں اس اختلاف کے نہ ہونے کی کبھی تمنا اور آرزو نہیں کروں گا، اس لیے کہ اس سے امت کے لیے وسعت پیدا ہوتی ہے۔ (ابن عبدالبر جامع بیان العلم وفضلہ ۲/۸۰ المکتبۃ العلمیۃ المدینۃ المنورۃ) آج مغربی دنیا اپنے ہاں کے تنوع اور Pluralism پر بڑا ناز کرتی ہے، لیکن تنوع کے حسن کو سب سے پہلے ان فقہا نے اسلامی تعلیمات سے سمجھا ہے۔ عمر بن عبدالعزیزؒ وہ شخصیت ہیں جنہوں نے سرکاری مراسلے کے ذریعے تدوینِ حدیث کا کام شروع کرایا تھا اور متعدد جلیل القدر محدثین نے ان کے فرمان کے مطابق حدیث کے مجموعے تیار بھی کیے تھے۔ اگر حدیث کے کسی مجموعے کا یہ مصرف ہوتا کہ اس کو بنیاد بنا کر پہلے سے چلے آرہے فقہی تنوع کو ختم کیا جائے تو عمر بن عبدالعزیزؒ یہ حکم جاری کرتے کہ میرے تیار کرائے ہوئے ان مجموعوں کو حَکَم اور فیصل مان کر جو بات اس میں نہ ہو، اسے ردّ کر دیا جائے۔ لیکن انہوں نے نہ صرف ایسا نہیں کیا بلکہ اس کے برعکس اپنی خلافت کے زیرِ نگیں تمام بلاد وامصار میں یہ مراسلہ لکھوایا کہ ہر علاقے کے فقہا جس چیز پر مجتمع ہوں، اس علاقے میں اسی کے مطابق فیصلے کیے جائیں۔ (سنن الدارمی حدیث نمبر: ۶۴۱ باب اختلاف الفقہاء)

تدوینِ حدیث ہی کے سلسلے میں ایک بڑا نام امام مالکؒ کا ہے۔ ان کی ''الموطا'' کو بجا طور پر صحاحِ ستہ کی ماں کہا جاتا ہے۔ ان کے سامنے بھی خلیفۂ وقت کی طرف سے یہ پیشکش کی گئی کہ موطا کو بطورِ قانون خلافت کے زیرِ نگیں تمام علاقوں میں نافذ کر کے لوگوں اس پر عمل کا پابند کر دیا جائے، لیکن امام مالکؒ نے اس سے منع کرتے ہوئے فرمایا کہ لوگوں تک پہلے بہت سی باتیں پہنچ چکی ہیں، صحابہ کے اقوال میں سے جو باتیں ان تک پہلے پہنچ چکی ہیں، ان کی پیروی وہ اختیار کر چکے ہیں۔ اب جن چیزوں کو وہ اپنا چکے، ہیں ان سے انہیں روکنا بڑا گراں امر ہوگا، اس لیے لوگوں کو اپنی حالت پر ہی رہنے دیجیے اور ہر خطے کے لوگوں نے اپنے لیے جس راہِ عمل کو اختیار کر لیا ہے، اسے یونہی رہنے دیجیے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز اور امام مالک کے اس طرزِ عمل میں دعوتی کام کرنے والوں کے لیے ایک بڑا سبق یہ مضمر ہے کہ جس علاقے میں لوگوں کی دین کے حوالے سے کسی شخصیت یا شخصیات سے وابستگی پیدا ہو چکی ہو، اس پر زد لگانے میں احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ دعوتی کام کرنے والوں سے بسا اوقات یہ غلطی ہو جاتی ہے کہ کسی خطے میں جاتے ہی وہاں پہلے سے موجود دینی وابستگی پر ہتھوڑا چلا دیتے ہیں جس سے ایک خلا پیدا ہو جاتا ہے جو بعض اوقات بہت خطرناک ثابت ہوتا ہے۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ علمِ حدیث جیسے مبارک اور توسع وتنوع رکھنے والے علم کا آخری دور میں یہ بڑا عجیب وغریب مصرف نکالا گیا ہے کہ اسے فقہی کشتی کا ایک میدان بنا لیا گیا اور ایک دوسرے کا سر کچلنے کے لیے اس سے ہتھوڑے کا کام لیا جانے لگا ہے۔ یہ بات میں کسی خاص مکتبِ فکر کے بارے میں نہیں کہہ رہا بلکہ تقریباً تمام مکاتبِ فکر میں اس طرح کے رویّے موجود ہیں، اور یہ وبا پاکستان یا برّصغیر کے ساتھ بھی خاص نہیں ہے، بلکہ عرب دنیا کی کئی یونیورسٹیوں خصوصاً بعض برادر ملکوں کی مذہبی چھاپ رکھنے والی یونیورسٹیوں میں بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔ اگر حدیث کی کتابت وتدوین کا یا کسی حدیثی

مجموعے یا مجموعوں کا یہی مصرف ہوتا تو سب سے پہلے یہ کام اس شعبے کے مجدد عمر بن عبدالعزیزؒ کرتے، محدثین کے سرتاج امام مالک کرتے، جن کے موطا کو ایک وقت تک اصح الکتب کہا گیا، امام بخاری کرتے جن کی کتاب کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ کا لقب دیا گیا، صحاحِ ستہ کے دیگر مؤلفین کرتے جن کے مجموعوں کو امت میں سب سے زیادہ تداول حاصل ہوا۔ لیکن علمی دنیا جانتی ہے کہ فقہی استنباطات واستدلالات کے لیے ان مجموعوں سے استفادہ تو ضرور کیا گیا لیکن فقہی اختلافات کے مکمل تصفیے اور آخری وحتمی فیصلے کے لیے انہیں استعمال نہیں کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث کے ایک سے بڑھ کر ایک مجموعے سامنے آتے رہے اور فنی مقبولیت حاصل کرتے رہے، لیکن فقہی اور عملی دنیا جوں کی توں رہی، اس میں کوئی بڑا فرق واقع نہیں ہوا۔ آج ہم اگر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام زمانے کے چیلنجز کا سامنا کر سکتا ہے، ہر دن کا سورج جو بے شمار نئے سوالات لے کر نکلتا اور نہ معلوم کتنے سوالات چھوڑ کر غروب ہوتا ہے، ان کے قابلِ عمل جوابات اگر ہم اسلامی تعلیمات کی روشنی میں دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں جس کی دنیا واقعی پیاسی ہے اور ہمہ پہلو عالمی بحرانوں نے اس عظیم کام کے لیے لوہا گرم کر دیا ہے اور دنیا کی سوالیہ نظروں کے سامنے اسلام کا معتدل اور متوازن متبادل پیش کرنے کا بہترین موقع ہے، امت مسلمہ کے کندھوں پر پڑی ہوئی اس انسانی ذمہ داری سے ہم عہدہ برآ ہونا چاہتے ہیں تو قرآن کے ساتھ ساتھ ہمیں حدیث کا وسیع ترین تناظر میں مطالعہ کرنا ہوگا۔ اس مقصد کے لیے ہمیں اپنے اس طرزِ عمل پر نظر ثانی کرنا ہوگی جس کے تحت حدیث کے علم کو ایک تو ہم نے چند ابواب تک محدود کر دیا ہے، دوسرے اس کو ایسے مصرف میں استعمال کرنے لگے ہیں جو قرونِ اولیٰ کے محدثین کو کبھی نہیں سوجھا تھا۔ یہاں سے ہم اپنی توانائیوں کو بچانے میں کامیاب ہو جائیں تو اس بچت کی، حدیث کے حوالے سے زیادہ نفع بخش جگہوں پر سرمایہ کاری ہو سکتی ہے۔

میرا یہ مقصد نہیں ہے کہ درسِ حدیث میں فقہا کے اقوال اور ان کے مستدلات زیرِ بحث نہیں آنے چاہییں، بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ فقہی اختلاف کی جو حیثیت سلف میں متعارف تھی، وہ ذہنوں میں واضح رہے اور ان فقہی مباحث کا مقصد ہار جیت نہ ہو بلکہ مقصد محض فقہا کے مدارک کو جاننا اور یہ معلوم کرنا ہو کہ ایک ہی موضوع پر وارد مختلف احادیث کو کن کن فقہا نے کس طرح سمجھا اور ان سے کیسے استدلال واستنباط کیا۔ اندازِ فکر وبیان کی اس تبدیلی سے یہی بحثیں طلبہ کے لیے ایسا تطبیقی اور تمرینی مواد بن سکتی ہیں جس کے ذریعے ان میں نئے مسائل کا حل حدیث سے نکالنے کی صلاحیت پیدا ہو سکتی ہے۔

﴿۲﴾

قرآن کریم کی طرح حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ایک حدیث بظاہر جس باب یا موضوع سے متعلق نظر آ رہی ہوتی ہے، وہ درحقیقت صرف اسی کے بارے میں راہ نمائی نہیں کر رہی ہوتی بلکہ اس کے علاوہ بھی زندگی کے کئی شعبوں اور پہلوؤں کے حکم کے بارے میں اس سے اصولی یا فرعی روشنی حاصل ہو رہی ہوتی ہے۔ اس کی ایک اہم مثال وہ حدیثِ مبارک ہے جس میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو عمیر نامی ایک بچے کا پالتو پرندہ مرجانے پر اس سے فرمایا تھا: یا أبا عمیر ما فعل النغیر ۔ بظاہر ایک عام سی بات ہے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بچے کی دلداری کے لیے ارشاد فرمائی تھی، لیکن اپنے کئی بزرگوں سے سنا (فوری طور پر حوالہ نہیں مل سکا، اگر کوئی صاحب حوالے سے مطلع فرما دیں تو کرم ہوگا) کہ امام شافعیؒ نے ایک ہی رات میں لیٹے لیٹے اس حدیث سے بڑی تعداد میں مسائل کا استنباط فرمایا۔ چوتھی صدی ہجری کے ایک بزرگ ابن القاص الطبری نے اس حدیث سے مستنبط ہونے

والے مسائل پر باقاعدہ ایک رسالہ لکھا جس کا کافی حصہ ابن حجر نے فتح الباری میں اپنی طرف سے اضافات کے ساتھ نقل کر دیا ہے۔ ابن القاص الطبری نے اس رسالے کی وجہِ تالیف ہی یہ بتائی ہے کہ بعض لوگ محدثین پر اعتراض کرتے ہیں کہ وہ اپنی کتابوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کئی ایسی باتیں نقل کر دیتے ہیں جن کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ (فتح الباری: کتاب الأدب: باب الکنیۃ للصبی)۔ انہوں نے اس حدیث کو ایک مثال بنا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بظاہر معمولی نظر آنی والے بات بھی رشد وہدایت کا سرچشمہ ہوتی ہے۔

حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی خصوصیت کا مظہر وہ مشہور واقعہ بھی ہے جسے خطیب بغدادی نے اپنی کتاب ''الفقیہ والمتفقہ'' میں اور ابن عبدالبر نے ''جامع بیان العلم وفضلہ'' میں اپنی اپنی سند سے نقل کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ اور امام اعمش کی موجودگی میں کوئی فقہی سوال زیر بحث آتا تو امام ابوحنیفہ اس کا حکم بیان فرماتے۔ امام اعمش دلیل پوچھتے تو امام ابوحنیفہ فرماتے کہ اس کی دلیل فلاں حدیث ہے جو آپ نے ہمارے سامنے اپنے فلاں شیخ کی سند کے ساتھ روایت کی تھی اور فلاں حدیث ہے جو آپ نے فلاں شیخ سے روایت کی تھی۔ (یاد رہے کہ اعمش حدیث میں امام ابوحنیفہ کے شیخ ہیں) گویا وہ حدیث بظاہر جس موضوع سے متعلق نظر آ رہی ہوتی، امام ابوحنیفہ اس سے ہٹ کر بھی اس سے مسائل مستنبط فرماتے جن کی طرف خود اعمش کا ذہن منتقل نہ ہوا ہوتا۔ اس پر اعمش فرماتے ہیں: یا معشر الفقہاء أنتم الأطباء ونحن الصیادلۃ۔ یعنی ہم محدثین کی حیثیت پنساری اور ادویات کے سٹاکسٹ کی ہے اور تم فقہا کی حیثیت طبیب کی ہے جو جانتا ہے کہ کون سی دوائی کہاں کہاں اور کیسے استعمال ہو سکتی ہے۔ (خطیبِ بغدادی: الفقیہ والمتفقہ ۲/۱۶۴ دار ابن الجوزی السعودیہ ۱۴۲۱ھ، ابن عبدالبر: جامع بیان العلم وفضلہ ۲/۱۳۱ باب ماذکر من ذم الاکثار من الحدیث دون التفھم والتفقہ فیہ، دار الکتب العلمیۃ بیروت ۱۳۹۸ھ)

محدثین کے طبقے میں امام بخاریؒ کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے حدیثِ نبوی کے اس اہم پہلو کو اپنے منہج تالیف کا باقاعدہ ایک حصہ بنا کر اپنے قاری کے اندر طبابت کی یہ شان پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ وہ ایک ہی حدیث مختلف جگہوں پر مختلف عنوانات کے تحت روایت کرتے ہیں، بعض مواقع پر استدلال کے لیے صریح اور واضح طور پر متعلقہ حدیث کو چھوڑ کر بظاہر بالکل غیر متعلقہ باب کی حدیث لے آتے ہیں۔ اس طریقے سے وہ حدیث کی زرخیزی، زندگی کے مختلف شعبوں کے بارے میں راہ نمائی کے لیے اس کے امکانات (Potential) کو اپنے قاری کے ذہن میں راسخ کرنا اور اسے اس کے استعمال کا عادی بنانا چاہتے ہیں۔

ہمارے قریب زمانے کے محدثین میں حضرت مولانا بدرِ عالم میرٹھی رحمہ اللہ کے اندر اللہ تعالیٰ نے امام بخاریؒ والی صلاحیت بطورِ خاص ودیعت فرمائی تھی جس کا سب سے زیادہ مظاہرہ ان کی کتاب ''ترجمان السنۃ'' میں ہوا ہے۔ اس میں انہوں نے یہ کام کیا ہے کہ ان کے دور میں جو فکری واعتقادی مسائل لکھے پڑھے حلقوں میں زیر گردش تھے، ان کے جوابات حدیث کی روشنی میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے، اور اس سلسلے میں انہوں نے اپنا مواد کتبِ حدیث کے صرف کتاب الایمان وغیرہ سے حاصل نہیں کیا، بلکہ پورے ذخیرۂ حدیث سے چھان چھان کر حاصل کیا ہے۔ عنوان وہ اپنے زمانے کے پیدا شدہ سوالات سے لیتے ہیں اور اس کے تحت حدیث ایسی جگہ اور ایسے باب سے لاتے ہیں جس کی طرف عام قاری تو کجا، حدیث سے مزاولت رکھنے والوں کا ذہن بھی اس طرف منتقل نہیں ہو پاتا، لیکن جب اس حدیث کو اس سوال اور عنوان

کے تحت دیکھتے ہیں تو بلا تکلف اس سے اس سوال کا جواب مل رہا ہوتا ہے۔

آج کے دور نے جو معاشی، سیاسی، قانونی، بین الاقوامی امور سے لے کر خاندانی اور نجی زندگی تک کے بارے میں عملی اور فکری سوالات پیدا کر دیے ہیں، ان کے جوابات کے لیے حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس صلاحیت اور زرخیزی سے فائدہ اٹھایا جانا ضروری ہے۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اپنے تدریسی نظام میں شعوری طور پر اس بات کی کوشش کریں کہ طلبہ کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہو۔ اس مقصد کے لیے ہمیں چند کام کرنا ہوں گے:

(۱) ہمارے دینی مدارس میں آخری دو درجے ایسے ہوتے ہیں جن میں حدیث کی تدریس نقطۂ عروج تک پہنچ جاتی ہے۔ طالب علم کے ان تک پہنچنے سے پہلے پہلے عصرِ حاضر میں اٹھنے والے سوالات بالخصوص سوشل سائنسز سے متعلق سوالات سے مناسب حد تک آگاہی ہو جانی چاہیے۔ اول تو وفاق المدارس کو اس سلسلے میں سوچنا چاہیے اور وہ اگر ایسا نہیں کر پاتا تو کم از کم بڑے جامعات اس سلسلے میں اپنے طور پر قدم اٹھا سکتے ہیں، خاص طور پر ان سالوں میں جن کا امتحان وفاق لیتا ہے۔ ہر مرحلے کے پہلے سال کا امتحان ابھی تک وفاق نہیں لے رہا۔ اس کے برقرار رہنے کے حق میں ایک دلیل یہ بھی دی جا رہی ہے کہ اس طرح سے چند اداروں کی سطح پر سہی، اس طرح کے انتظامات کی توقع کی جا سکتی ہے۔ جب تک طالب علم موجودہ دور کے سوالات اور ان کے فکری اور تہذیبی پس منظر سے ہی آگاہ نہیں ہوگا بلکہ اس طرح کے موضوعات سے متعلقہ لب و لہجے سے واقف نہیں ہوگا، اس وقت تک اگلا کام ناممکن تو نہیں، خاصا مشکل ضرور ہو جائے گا۔ ایک ریاست میں فرد کی کیا حیثیت ہونی چاہیے، فرد اور ریاست کے حقوق کن بنیادوں پر استوار ہونے چاہییں، معاہدۂ عمرانی کیا ہوتا ہے اور اسلام کا نقطۂ نظر ان کے بارے میں کیا ہے، طلب و رسد کی قوتیں کیا ہیں اور معیشت کو کس حد تک ان کے رحم و کرم پر چھوڑا جا سکتا ہے، دولت کی پیدائش اور تقسیم میں ریاست کا کردار کیا ہونا چاہیے، زر کی زمانی قدر (Time value of money) کس حد تک قابل اعتبار ہے، اس طرح کے بے شمار سوالات ہیں جن سے اور ان کے پس منظر سے ہمارا طالب علم آگاہ نہیں ہوتا، حالانکہ اس طرح کے کئی سوالات کے صرف عنوانات نئے ہوتے ہیں، ورنہ قدیم فقہا و متکلمین کے ہاں وہ بحثیں موجود ہوتی ہیں۔ اگر طالب علم ان چیزوں سے کسی قدر واقف ہو چکا ہو تو حدیث کی روشنی میں ان موضوعات پر اس کے سامنے بات کرنا کافی آسان ہو سکتا ہے، بلکہ ذہین طالب علم تو بہت سے سوالات کے جوابات تو خود ہی حاصل کر لے گا۔

(۲) اساتذۂ کرام درسِ حدیث کے دوران موقع بموقع طلبہ کو بتاتے رہیں کہ کون سی حدیث کس طرح عصر حاضر سے تعلق رکھنے والے فلاں مسئلے پر روشنی ڈال رہی ہے۔ مثلاً آج بہت سے مسلمان ایسے ممالک میں آباد ہیں جہاں وہ اقلیت میں ہیں، انہیں وہاں کے عرف، رواج اور نظام کے بارے میں کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے؟ کیا بالکلیہ وہاں کے نظام کو مسترد کر کے اس کے خلاف بغاوت کر کے انارکی پیدا کر دینی چاہیے اور پہلے سے چلے آنے والے ڈھانچے کو کہہ دینا چاہیے کہ اگر ہم نہیں تو تم بھی نہیں، کیا اسے بالکل تلپٹ کر کے خلا پیدا کر دینا چاہیے یا کوئی اور راستہ بھی ہو سکتا ہے؟ مکی دور کی احادیث، اسی طرح سے ان صحابہ کے بارے میں احادیث سے جو کسی دینی مصلحت کے تحت مستضعفین میں سے ہونے کی وجہ سے ہجرت نہیں کر سکے تھے، اس پر روشنی پڑ سکتی ہے۔ لیلۃ العقبہ اور بیعۃ العقبہ سے متعلق جہاں کہیں احادیث آتی ہیں، وہاں طلبہ کی توجہ اس طرف مبذول کرائی جا سکتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں جو سب سے پہلی ریاست قائم فرمائی ہے، وہ کسی عسکری انقلاب پر مبنی نہیں تھی بلکہ اس کی بنیاد دو معاہدوں پر تھی۔ سب سے پہلا اور اساسی

معاہدہ تو یہی بیعت عقبہ ہے جس کے ایک فریق تو اوس وخزرج کے مختلف خاندانوں کے نمائندہ حضرات تھے اور دوسرا فریق خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ اس معاہدے کے محرک اول بھی اوس وخزرج ہی تھے۔ طلبہ کی توجہ ہم صحیح بخاری ہی میں مروی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس روایت کی طرف بھی مبذول کرا سکتے ہیں جس میں وہ بتلاتی ہیں کہ ان کی باہمی جنگوں کے ذریعے درحقیقت اللہ تعالیٰ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے راہ ہموار کی تھی کہ ان میں ان کے بڑے بڑے سردار مارے گئے اور قیادت کا خلا پیدا ہو چکا تھا اور جنگوں سے تنگ آ کر مشترکہ قیادت کی ضرورت کا احساس بھی پیدا ہو چکا تھا۔ اس ضرورت کی تکمیل کے امکانات بھی انہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں نظر آ رہے تھے۔ دوسرا اہم معاہدہ ''میثاقِ مدینہ'' ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ تشریف آوری کے بعد فرمایا اور اس کے ذریعے دیگر کئی قبائل بھی اس ریاست کا حصہ بن گئے۔ ریاستِ مدینہ کی اساس کے بارے میں یہ بنیادی بات اگر ذہن میں بیٹھ جائے تو دوسرے بہت سے مسائل حل ہو سکتے ہیں اور یہ بات کئی جگہوں پر کام دے سکتی ہے۔ یہ تو محض ایک مثال ہے، مزید مثالیں عرض کی جائیں تو بات کافی لمبی ہو جائے گی۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جہاں جہاں جس حدیث سے عصرِ حاضر کے کسی مسئلے پر روشنی پڑتی ہو، طلبہ کی اس طرف توجہ مبذول کرائی جائے، اور جہاں ضرورت ہو، وہاں متعلقہ سوال اور بحث کے پس منظر سے بھی انہیں آگاہ کیا جائے۔ اس طرح ان کے اندر مزید فکر واستنباط کی صلاحیت پروان چڑھے گی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وفاق کا امتحان دینے والے طلبہ کی خاطر امتحانی نقطۂ نظر اس طرزِ تدریس میں مشکلات کا باعث ہو سکتا ہے، اس لیے جب تک وفاق اس پہلو سے مناسب فیصلے نہیں کر پاتا، جہاں تک ممکن ہو اس حد تک تو یہ کام کرنا چاہیے۔

(۳) ہمارے مدارس میں دورۂ حدیث شریف میں ایک مرحلہ کتبِ حدیث کے سرد اور تلاوت کا ہوتا ہے۔ اس طرز کے حق اور مخالفت میں مختلف دلائل دیے جاتے ہیں، یہاں ان سے بحث مقصود نہیں۔ یہاں یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ اگر یہ طریقہ جاری رکھنا ہو تو اس کا مقصد کتابیں ختم کرنے کی رسمی کارروائی نہ ہو، بلکہ اسے سرسری سہی، اجتماعی مطالعۂ حدیث میں تبدیل کیا جائے۔ طلبہ سے کہا جائے کہ وہ درس کے اس دورانیے کو اہمیت دیں، متیقظ ہو کر بیٹھیں، کاغذ یا نوٹ بک اور قلم، ترجیحاً کچی پنسل ساتھ لے کر بیٹھیں، مختلف احادیث جو مختلف جگہوں میں گزری ہیں، ان میں جو فرق محسوس ہو، اسے نشان زد کریں، جہاں احادیث ایک دوسرے کی تائید کر رہی ہوں، انہیں نشان زد کریں، جہاں بعض طرق کے بعض الفاظ حدیث کی مختلف تشریحوں میں سے کسی خاص تشریح کی تائید کر رہے ہوں یا نئی تشریح یا توجیہ وغیرہ کی طرف آپ کا ذہن منتقل کر رہے ہوں، انہیں خواہ اشارے ہی کے درجے میں ہو، نوٹ کریں۔ دورانِ تلاوت، حدیث سے جو نیا استنباط، خاص طور پر جو حدیث کے متعلقہ باب سے بظاہر ہٹ کر ہو، اسے نوٹ کریں۔ کسی بھی کتاب کے انفرادی مطالعے اور اس کی سرد و تلاوت میں ایک فرق یہ ہے کہ انفرادی مطالعے میں حواس ظاہرہ میں سے صرف آنکھیں استعمال ہو رہی ہوتی ہیں اور یہاں آنکھوں کے ساتھ کان بھی استعمال ہو رہے ہوتے ہیں، اس لیے کہ ایک طالب علم پڑھ رہا ہوتا ہے اور باقی سن رہے ہوتے ہیں، اور تعلیم کے عمل میں جتنے زیادہ حواس بیک وقت استعمال رہے ہوں، وہ اتنی ہی مؤثر ہوتی ہے۔ اس لیے سرد و تلاوت کے اس مرحلے سے بہت سے مفید کام لیے جا سکتے ہیں، بالخصوص ذی استعداد طلبہ کے حوالے سے۔ مثلاً ایک مخصوص دورانیے مثلاً ایک ہفتے یا ایک مہینے کے درمیان ہم ان میں مقابلہ کرا سکتے ہیں کہ دورانِ تلاوت کون اس طرح کی چیزوں کو زیادہ نوٹ

کر سکتا ہے۔ اچھی کارکردگی دکھانے والے طلبہ کی مختلف طریقوں سے حوصلہ افزائی بھی کی جا سکتی ہے۔

﴿۳﴾

حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک بہت بڑا کردار بلکہ شاید سب سے اہم کردار عام لوگوں کی نجی، گھریلو، معاشرتی، روحانی زندگی وغیرہ میں راہ نمائی اور ان کے اخلاق وکردار کی اصلاح ہے۔ آج کا مسلمان اپنی زندگی کے ہر شعبے میں دین سے جتنا دور ہو چکا ہے بلکہ دین کے بہت سے شعبوں میں بنیادی شعور تک موجود نہیں ہے، اس سب کا مداوا حدیث کے فیض کو عام لوگوں تک پہنچانا ہے۔ تجربہ یہ ہے کہ اس معاملے میں درسِ حدیث وغیرہ کی تاثیر درسِ قرآن سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ محدثینِ کرام نے بجا طور پر کہا ہے کہ حدیث نبوی میں اشتغال ایک گونہ صحبت نبوی سے مستفید ہونا ہے۔ عامۃ الناس کی اصلاح وارشاد کے لیے حدیث کے حوالے سے جو بات ہوگی، اس پر بھی ان شاء اللہ یہ بات صادق آئے گی۔ تجربہ یہی ہے کہ حدیث کے حوالے سے خصوصاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی واقعات کے حوالے سے جو بات کی جائے، اس سے نہ صرف راہ نمائی ملتی ہے بلکہ عمل کا جذبہ اور داعیہ بھی پیدا ہوتا ہے۔ اس کی ایک واضح مثال تبلیغی جماعت اور فضائل اعمال سے دی جا سکتی ہے۔ جن جن اعمال کے بارے میں اس کتاب کے ذریعے حدیثیں سنی اور سنائی جاتی ہیں، وہ بہر حال ان میں کافی حد تک راسخ ہو چکے ہوتے ہیں۔ اس لیے ہمارے تدریسِ حدیث کے با قاعدہ اور مقصودی اہداف میں یہ بات شامل ہونی چاہیے کہ طلبہ کو اس کام کے لیے تیار کیا جائے۔ اس کے لیے یہاں چند گزارشات پیش خدمت ہیں۔

احادیث کا وہ حصہ جو زہد، رقاق، آداب اور عام اخلاقی وعملی زندگی سے تعلق رکھتا ہے، تدریس میں اسے بھی خاطر خواہ اہمیت دی جائے، انہیں آسان ابواب سمجھ کر رواروی میں گزارنے کا انداز اختیار نہ کیا جائے۔ ویسے تو پوری حدیث بلکہ ہر فن کی تدریس میں تطبیقی پہلو بڑا اہم ہوتا ہے تاکہ پڑھنے والوں کو پتا چلے کہ یہ باتیں کہاں کیسے منطبق ہوں گی، لیکن خاص طور پر ان احادیث کا ہماری جیتی جاگتی زندگی کے ساتھ ربط اور جوڑ واضح کر کے دکھایا جائے تاکہ وہ عامۃ الناس کے سامنے اسی انداز سے حدیث نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم کو پیش کر سکیں۔

آج زندگی کو منضبط کرنے اور اسے کامیاب بنانے کے گر ایک مستقل فن بن چکا ہے جس پر مختلف معیاروں کی بے شمار کتابیں مارکیٹ میں آ رہی ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر میں نفسیات کے علم سے استفادہ کیا گیا ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ احادیثِ مبارکہ میں اس حوالے سے اتنا مواد موجود ہے کہ اسے بنیاد بنا کر اس طرح کے موضوعات پر کتابوں کی پوری ایک سیریز تیار کی جا سکتی ہے۔ مثال کے طور پر مشکوٰۃ شریف کے "باب الحذر والتأنی فی الأمور" کی حدیثوں کو ہم دیکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح توکل، تسلیم ورضا، حسد وغیرہ سے متعلق احادیث کو بالخصوص صوفیہ کی تشریح کے ساتھ دیکھا جائے تو ہمارے بہت سے نفسیاتی مسائل اور رویّوں کے بحران کا، جو جگہ جگہ کامیابی کی راہ میں ہمارے پاؤں کی بیڑیاں بن جاتے ہیں، حل مل سکتا ہے۔ غصہ انسانی فطرت کا ایک لازمہ ہے، اسے ختم نہیں کیا جا سکتا، البتہ اسے کنٹرول کرنا ضروری ہوتا ہے۔ غصے کو کنٹرول کیسے کیا جائے، آج یہ نفسیات کا اہم موضوع تو ہے ہی، اسے انتظامی علوم (Management Sciences) کے نصابات میں بھی جگہ ملنے لگی ہے۔ دنیا کو اس موضوع کی اہمیت کا آج احساس ہوا ہے۔ حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اس حوالے سے چودہ صدیاں پہلے خاصا مواد موجود ہے اور اس سلسلے میں بہت ہی قیمتی اور کارگر گُر بتائے گئے ہیں۔ گھروں اور اداروں وغیرہ میں باہمی اعتماد کے مسائل کیسے پیدا ہوتے اور وہ کس طرح نقصان پہنچاتے ہیں اور ان سے

بچنے اور نمٹنے کا طریقہ کیا ہوسکتا ہے، حسنِ ظن، سوءِ ظن، نمیمہ (چغل خوری) سنی سنائی بات آگے چلانا، باہمی مشاورت وغیرہ موضوعات کی حدیثوں میں اس کے بارے میں بہت سے شاندار اصول ملتے ہیں۔ گھریلو زندگی بالخصوص زوجین کے تعلقات تو حدیث کا ایک اہم موضوع ہیں جس پر احادیث کی کافی زیادہ تعداد موجود ہے۔ مثال کے طور پر اس حوالے سے ایک قرآنی آیت ہے کہ 'عسى أن تكرهوا شيئا و يجعل الله فيه خيرا كثيرا' (النساء:۱۹) ''ہوسکتا ہے تم ان کی کسی بات کو ناپسند کرو اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے اسی میں بڑی خیر رکھی ہو۔'' اسی طرح حدیث نبوی میں ہے کہ 'لا يفرك مؤمن مؤمنة إن كره منها خلقا رضي منها آخر' (صحیح مسلم، کتاب الرضاع: باب الوصیۃ بالنساء) ''کوئی مؤمن کسی مؤمنہ سے نفرت کا رویہ اختیار نہ کرے، ہوسکتا ہے اس کی کوئی ایک بات اسے ناپسند ہو تو دوسری پسندیدہ بات بھی اس میں موجود ہو۔'' انہی دو نصوص کو لے لیا جائے تو نہ معلوم کتنے مسائل حل ہو سکتے اور تعلقات کے کتنے بحران ختم ہو سکتے ہیں، اس لیے کہ ان میں یہ بتایا گیا ہے کہ ایثار و ہمدردی کے ساتھ برداشت کرنے کے اعلیٰ اصول کو نہ بھی اپنانا ہو اور اپنے مفاد اور غرض ہی کے نقطۂ نظر سے دیکھنا ہو، تب بھی تجزیہ بہر حال حقیقت پسندانہ اور عملیت پسندانہ ہونا چاہیے۔

یہ تو محض چند مثالیں ہیں، وگرنہ کتنی حدیثیں ہیں جن کا ہماری روزمرہ کی زندگی کی الجھی ڈوروں کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے، لیکن یہ احادیث تو نہ ہماری تدریسی دنیا میں اجاگر اور ہائی لائٹ ہوتی ہیں اور نہ ہی وعظ و نصیحت کی دنیا میں، اس لیے ہماری تدریس حدیث میں اس بات کی کوشش ہونی چاہیے کہ طلبہ کے اندر اس طرح کی احادیث کو سمجھنے ان سے نتائج اخذ کرنے اور انہیں تطبیقی انداز سے بیان کرنے کی صلاحیت پیدا ہو۔

دین اور انسانیت کی جو بہت اعلیٰ اخلاقی قدریں ہیں، جیسے سچائی، دیانت و امانت، عہد کی پاس داری، دھوکا نہ دینا، اکل اموال الناس بالباطل سے احتراز وغیرہ، ان کے بارے میں قولی احادیث بھی موجود ہیں اور سیرتِ طیبہ میں ایسی مثالیں بھی موجود ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ ان اقدار کی خاطر بڑی بڑی مصلحتوں کو قربان کیا جا سکتا ہے۔ اس کی ایک واضح مثال حدیبیہ کے معاہدے کی پاس داری کا وہ انداز ہے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوجندل اور ابوبصیر کے بارے میں اختیار فرمایا۔ آج بدقسمتی ہے یہودیوں کی طرح مسلمانوں میں بھی ایسے رویّے رواج پا رہے ہیں کہ محض معمولی تاویلوں اور حیلوں سے ان بنیادی اصول واقدار میں لچک پیدا کر لی جاتی ہے۔ ایسے لوگ بھی مل جائیں گے جو خیر سے پیشاب کا تو باریک سا چھینٹا بھی بدن یا کپڑوں پر گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے، لیکن دھوکا، فریب، حق تلفی کے جواز کے لیے معمولی تاویل بھی کافی ہو جاتی ہے۔ جب حدیث کی تدریس میں اعلیٰ اخلاقی قدروں کی اہمیت کے یہ پہلو اجاگر ہوں گے تو انہی طلبہ کے ذریعے، جو کل کے دینی راہ نما ہیں، یہ باتیں عام مسلمانوں تک بھی پہنچیں گی۔

حدیث کے عملی اور اخلاقی پیغام کو لوگوں تک پہنچانے اور اس کی تخم ریزی میں زبان و بیان کا مسئلہ بھی بڑا اہم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے طلبہ اس زبان اور لہجے میں بات کرنے سے قاصر ہوتے ہیں جسے عام آدمی سمجھ سکے۔ ہمارے ہاں کم و بیش آٹھ سال کے دوران طالب علم جس زبان سے آشنا ہوتا اور استعمال کا عادی ہوتا ہے، اس سے یا تو وہ لوگ مستفید ہو سکتے ہیں جو بہت عرصے سے علما کے ماحول سے وابستہ ہیں یا ایک محدود طبقہ جو خاص قسم کی تقریریں سننے کا عادی ہو چکا ہے۔ ان کے علاوہ لوگوں تک ان کی زبان اور لب و لہجے کے ذریعے ابلاغ بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس مسئلے کا تعلق محض حدیث کے ساتھ ہی نہیں، پورے دین کے ساتھ ہے اور مستقل موضوعِ بحث ہے۔ ہمارے ہاں تخصص فی الافتا کے طلبہ

بعض اوقات فتویٰ دکھانے کے لیے لاتے ہیں تو اس کی زبان دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اسے سمجھے گا کون؟ ہمارے مدارس کے تدریسی نظام میں زیر درس کتاب کے متعلقہ حصے کا ترجمہ کرنا تدریسی عمل کا لازمی جز سمجھا جاتا ہے، لیکن کہنے کو تو یہ اردو میں یا کسی مقامی زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہوتا ہے لیکن درحقیقت وہ ایک بالکل نئی اور منفرد زبان ہوتی ہے جو صرف ان مدارس کی چار دیواری میں ہی پائی جاتی ہے۔ (بقول مولانا زاہد الراشدی کے یہ ان مدارس کی اسپرانتو ہے) ثانیہ سے لے کر مشکوٰۃ شریف تک حدیث کی جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، ان میں ترجمہ کرنے کا خاص اہتمام ہوتا ہے، لیکن وہ ترجمہ ایسا ہوتا ہے کہ اگر عام آدمی کے سامنے کیا جائے تو محض ترجمے سے وہ حدیث کا مفہوم اور پیغام حاصل نہیں کر پائے گا، اور چونکہ پوری طالب علمی کے زمانے میں وہ اسی زبان میں ترجمہ کرنے کے عادی ہو چکے ہوتے ہیں، اس لیے ایسی اطلاعات ملتی رہتی ہیں کہ جب انہیں درسِ حدیث وغیرہ کا موقع ملتا ہے تو اس میں بھی وہ اسی زبان کے استعمال پر مجبور ہوتے ہیں، اور انہیں احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ کوئی نامانوس زبان بول رہے ہیں۔ اس لیے اساتذۂ حدیث اور مدارس کے ذمہ داران کو اس پہلو پر بھی خاص توجہ دینی چاہیے اور طلبہ کو اس قابل بنانے کا اہتمام کرنا چاہیے کہ وہ عام مسلمانوں تک حدیث کا پیغام "بلسان قومہ" کا مصداق بن کر پہنچا سکیں، خواہ وہ اردو زبان ہو، مقامی زبان ہو یا کوئی اور۔ اس مقصد کے لیے طلبہ پر محنت سے پہلے حدیث پڑھانے والے اساتذہ کے لیے باقاعدہ تربیتی کورسز اور ورکشاپس کا اہتمام ہونا چاہیے۔ جو حضرات سالہا سال سے ایک انداز میں ڈھل چکے ہیں، ان کے لیے تو خود کو تبدیل کرنا مشکل ہوگا لیکن کسی بھی مرحلے کی حدیث پڑھانے والے نوجوان مدرسین پر اس طرح کی محنت کارگر ثابت ہو سکتی ہے۔ ان میں سیکھنے اور اخذ کرنے کی صلاحیت بھی زیادہ ہوتی ہے اور ان کی تربیت کے اثرات بھی زیادہ دوررس ہوں گے، ان شاء اللہ۔

﴿۴﴾

ہمارے مدارس سے فارغ التحصیل ہونے والے حضرات، حدیث پر مزید علمی وتحقیقی کام کرنے کے قابل ہو سکیں، اس مقصد کے لیے چند اقدامات ضروری ہیں، خاص طور پر ایسے باصلاحیت اور ذہین طلبہ جن سے مستقبل میں اس نوعیت کے کاموں کی توقع رکھی جا سکتی ہے۔ ان میں سب سے پہلا کام تو یہ ہے کہ طلبہ کے میول ورجحانات کو جانچنے اور اس کی روشنی میں مستقبل کی منصوبہ بندی اور اپنے لیے کسی راہ کو اپنانے کے لیے راہ نمائی کا انتظام ہو۔ کم از کم ثانویہ خاصہ کے آخر تک طالب علم کو اس قابل ہو جانا چاہیے کہ وہ فیصلہ کر سکے کہ اس کو دینی علوم کی کس شاخ کے ساتھ زیادہ مناسبت ہے اور کس نوعیت کے کام اور خدمت کی طرف وہ اپنے اندر رجحان یا اہلیت زیادہ پاتا ہے۔ ہمارے نصابِ تعلیم کے حوالے سے بھی یہ صورتِ حال مستقل طور پر قابلِ نظرِ ثانی ہے کہ شروع سے آخر تک تمام طلبہ کو ایک ہی جیسے مضامین اور کتب کی تدریس اور ایک ہی انداز کے امتحانات سے گزرنا ہوتا ہے، اس لیے وفاق کے نظام کے پابند مدارس وجامعات، نصاب کے بارے میں تو میول ورجحانات کے جائزے سے کوئی استفادہ نہیں کر سکیں گے، لیکن غیر نصابی علمی سرگرمیوں کے بارے میں اپنے طلبہ کو راہ نمائی اور مدد ضرور فراہم کر سکیں گے۔

دوسرا کرنے کا کام یہ ہے کہ بحث وتحقیق کے مناہج واسالیب اور جدید طریقوں سے منتخب طلبہ کو روشناس کرایا جائے اور عملی کام کرایا جائے۔ اگرچہ اب متعدد جامعات میں دورۂ حدیث شریف کے سال میں جو تحقیقی مقالہ لکھوایا جاتا ہے، اسے مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ کے تحت حوصلہ افزا تو قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن اس سے خاطر خواہ نتائج عموماً برآمد نہیں ہوتے۔

اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ مشق تمام طلبہ پر یکساں کی جاتی ہے، جبکہ بعض جامعات میں دورے میں طلبہ کی تعداد سینکڑوں میں ہوتی ہے۔ اس وجہ سے وہ طلبہ متعلقہ نگران اساتذہ کی پوری توجہ اور راہ نمائی حاصل نہیں کر پاتے۔ دوسرے بہت سے اساتذہ خود اس میدان کے شناور نہیں ہوتے۔ تیسرے ایک سال میں یہ کام ''شب بھر میں پیدا بھی ہوا مجنون بھی ہوا اور مر بھی گیا'' کا مصداق ہوتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ یہ محنت چند منتخب طلبہ پر کی جائے اور یہ سلسلہ کم از کم خامسہ سے شروع کیا جائے اور تدریجاً انہیں آگے بڑھایا جائے۔

اس سلسلے میں کرنے کا تیسرا کام کمپیوٹر کے حوالے سے ہے۔ کمپیوٹر نے علمی وتحقیقی کاموں کو بہت آسان کر دیا ہے۔ اس کے ذریعے آدمی کو بیٹھے بٹھائے ان معلومات تک رسائی حاصل ہو جاتی ہے جو کسی زمانے میں لم یکونوا بالغیہ إلا بشق الأنفس کا مصداق تھیں۔ دینی علوم کے حوالے سے ایسے پروگرام اور مکتبات آ گئے ہیں جن کے ذریعے لاکھوں روپے مالیت کی کتابیں انسان کی میز پر ہوتی ہیں، جیسے مکتبۃ الفقہ وأصولہ، المکتبۃ الألفیہ فی السنۃ النبویۃ، الجامع الکبیر لکتب التراث اور المکتبۃ الشاملۃ وغیرہ۔ اس کے علاوہ عربی زبان میں بیسیوں ایسی ویب سائٹس ہیں جہاں سے بے شمار کتابیں ڈاؤن لوڈ کی جا سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ انٹرنیٹ کی سرچ کی آپشن کے ذریعے مثلاً ''گوگل'' اور ''یاہو'' وغیرہ سے بہت سی معلومات تک رسائی ممکن ہو گئی ہے۔ اگرچہ اہلِ فن، حدیث وفقہ وغیرہ کے بارے میں ان مکتبات پر انحصار کو پسند نہیں کرتے، ایک تو اس لیے کہ ان میں اغلاط ہوتی ہیں اور دوسرے اس لیے کہ طالب علم جب تک کتاب کو اپنے ہاتھ میں نہ پکڑے اور اس کے صفحات الٹ پلٹ نہ کرے، اس وقت اس میں فن کے ساتھ صحیح مناسبت پیدا نہیں ہوتی، لیکن پھر بھی کمپیوٹر کی ان سہولتوں کا استعمال بہت بڑے فائدے سے خالی نہیں، بالخصوص کمپیوٹر کے ذریعے تلاش اور بحث کا کام کافی حد تک آسان ہو جاتا ہے (اگرچہ فنی مزاولت اور مناسبت سے استغنا نہیں ہو سکتا) اور اس کی مدد سے خود کتب کی طرف مراجعت بھی کافی آسان ہو جاتی ہے۔ دوسرے جو شخص ایک عرصے تک کتابوں میں وقت گزار کر خاص قسم کی مناسبت پیدا کر چکا ہو، اس کے بارے میں یہ دوسرا اشکال بھی باقی نہیں رہتا۔ جہاں تک اغلاط کا تعلق ہے تو اول تو ان مکتبات کے جو نئے ایڈیشن آ رہے ہیں، ان میں پہلے کے مقابلے میں اغلاط کم ہیں، دوسرے ایک حوالے کو متعدد مکتبات میں دیکھنے سے کافی حد تک صحت کا وثوق ہو سکتا ہے۔ بہر حال کمپیوٹر کے ساتھ حد سے زیادہ حسنِ ظن اگرچہ غیر مناسب ہے لیکن وقت اور محنت بچانے والی اور زیادہ سے زیادہ معلومات ومواد تک رسائی دلانے والی اس سہولت سے فائدہ نہ اٹھانا بھی ناشکری سے کم نہیں۔

اگرچہ کمپیوٹر کا محض استعمال اتنی بڑی سیکھنے کی چیز نہیں اور انگریزی اور عربی زبانوں سے واقفیت ہو تو یہ خود اپنے بارے میں بہت کچھ سکھا دیتا ہے تاہم باقاعدہ سیکھنے سے طالب علم کا اس کے استعمال کے لیے حوصلہ بڑھ جاتا ہے۔ ہمارے کئی دینی مدارس وجامعات میں اب کمپیوٹر کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے، لیکن ایک تو عموماً وہ بہت سرسری ہوتا ہے، دوسرے بہت سے طلبہ کے ذہنوں میں یہاں بھی کمرشل پہلو غالب ہوتا ہے اور ان کے ذہن میں یہ ہوتا ہے کہ ٹائپنگ اور گرافکس وغیرہ سیکھ کر وہ چار پیسے بنانے کے قابل ہو جائیں گے۔ یہ پہلو بھی افادیت سے بالکلیہ خالی نہیں ہے، لیکن اصل ضرورت اس امر کی ہے کہ چند باصلاحیت طلبہ کو کمپیوٹر کے علمی وتحقیقی استعمال سے متعارف کرایا اور اس کا عادی بنایا جائے۔ بالخصوص علمِ حدیث کے حوالے سے اس مشین کی افادیت بہت زیادہ ہے۔ ایک تو اس علم کا مزاج ہی ایسا ہے کہ وہ بحث اور پھیلاؤ کا متقاضی ہے اور اس طرح کے کاموں کے لیے کمپیوٹر بہت مفید ہے۔ آپ اس کو کسی حدیث کا ایک آدھ لفظ دیں یا کسی

راوی وغیرہ کا نام دیں تو چند لمحوں میں اس سے متعلق مواد ہزاروں بلکہ لاکھوں صفحات میں سے ڈھونڈ کر آپ کے سامنے کر دے گا۔ دوسرے اس لیے کہ دینی علوم میں سے جس علم کے متعلق کمپیوٹر پروگرامز پر کام سب سے زیادہ ہوا ہے، وہ حدیث اور اس سے متعلقہ علوم ہی ہیں۔

کسی بھی حدیث پر بحث کے لیے یہ چیز بہت اہم ہوتی ہے کہ اس کی تمام روایات اور طرق سامنے ہوں۔ مدارِ سند راوی کی تعیین کر کے دیکھا جائے کہ اس کے نیچے کون کون سے راوی کن کن لفظوں کے ساتھ روایت کر رہے ہیں اور اس کی روشنی میں حدیث کے درست لفظ کو متعین کرنے کی کوشش کی جائے۔ عموماً ہوتا یوں ہے کہ پہلے دو تین اور کبھی چار طبقوں تک تو حدیث غریب ہوتی ہے، یعنی اوپر والے طبقوں میں سے ہر طبقے میں اسے روایت کرنے والا ایک ہی ہوتا ہے، نیچے کوئی راوی ایسا ہوتا ہے جس کے متعدد تلامذہ وہ حدیث اس سے روایت کر رہے ہوتے ہیں، ان کے نقل کردہ الفاظ اور سیاق میں بعض اوقات فرق بھی ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں ان تمام راویوں کی روایات کو مدنظر رکھنا پڑتا ہے۔ یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ کون سا راوی ثقاہت اور یادداشت وغیرہ کے اعتبار سے کیسا ہے، کس کو اپنے شیخ کے پاس زیادہ عرصہ رہنے کا موقع ملا، کون اس شیخ کی روایات زیادہ اہتمام سے نقل کیا کرتا تھا، کون سا راوی روایتِ حدیث میں زبانی یادداشت پر زیادہ اعتماد کرتا تھا اور کون سا تحریر دیکھ کر روایت کرنے کا اہتمام کرتا تھا، کس نے متعلقہ شخص سے بڑھاپے کی کمزوری (اختلاط) سے پہلے استفادہ کیا اور کس نے بعد میں، کون سے لفظ روایت کرنے والے تلامذہ کی تعداد زیادہ ہے وغیرہ وغیرہ۔ ان امور کو دیکھ کر روایت کے لفظ ایک حد تک متعین ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ امام ترمذی اور امام ابوداؤد وغیرہ نے بعض مواقع پر اس طرح کی بحثیں کر کے دکھائی ہیں، لیکن حدیث پر کام کرنے والے کو اس کی جا بجا ضرورت پڑتی ہے۔ کمپیوٹر پروگرام اس معاملے میں باحث کی کافی مدد کر دیتے ہیں۔ پھر ایک روایت کے الفاظ پر اس طرح کی بحث وتحقیق کے دوران اسی موضوع کی دیگر احادیث ونصوص کی روشنی میں بھی اسے دیکھنا ہوتا ہے۔ اس طرح کے سب کام کمپیوٹر کے ذریعے نسبتاً آسان ہو جاتے ہیں، لیکن ایک نوآموز شخص کو بہرحال اس سلسلے میں کسی کی راہ نمائی اور نگرانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کچھ طلبہ کو کمپیوٹر کے استعمال کا اس انداز سے عادی بنایا جائے کہ وہ اسے اس طرح کے کاموں کے لیے استعمال کر سکیں۔

﴿۵﴾

قرون اولیٰ میں حدیث کی جمع وتدوین اور فقہی استنباطات کا کام جب اپنے عروج کی طرف بڑھ رہا تھا تو حدیث ہی کے بارے میں ایک اور نوعیت کا کام شروع ہوا جسے ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

(۱) مختلف الحدیث کا علم، یعنی ایک موضوع پر وارد ہونے والی احادیث اگر متعارض نظر آئیں تو انہیں کیسے حل کیا جائے۔

(۲) مشکل الحدیث کا علم، اس کے مفہوم میں مختلف الحدیث کے علاوہ وہ احادیث بھی داخل ہو جاتی ہیں جن پر تجربے، مشاہدے، عقل یا زمانے کے مروّجہ علوم کی روشنی میں اعتراض وارد ہوتا ہے یا کسی اور وجہ سے اس کے سمجھنے میں مشکل پیش آ رہی ہوتی ہے۔

(۳) حدیث کی تشریح ووضاحت، خاص طور پر وہ احادیث جن کا براہِ راست فقہی احکام سے تعلق نہیں ہے۔

آگے تعبیر کی سہولت کے لیے ان تینوں شاخوں کے لیے ''حدیث کا معنوی پہلو'' کے لفظ استعمال کیے جائیں گے۔

اگر چہ اس نوعیت کے ابتدائی کام میں بعض ایسی شخصیات کا نام آتا ہے جو فقہ کے حوالے سے زیادہ معروف ہوئیں، جیسے امام شافعیؒ، لیکن بہرحال اپنی بنیادی غایت کے لحاظ سے یہ فقہ الحدیث سے مختلف میدان ہے۔ اس موضوع پر دستیاب تحریروں میں سب سے قدیم امام شافعیؒ (م:۲۰۴ھ) کی اختلاف الحدیث ہے جو ان کی ''الأم'' کے ساتھ چھپی ہے۔ پھر ابن قتیبہ (م:۲۷۶ھ)، طحاوی (م:۳۲۱ھ) اور ابن ابی فورک وغیرہ کے ہاتھوں یہ کام آگے بڑھا۔ مشکل الحدیث پر طحاوی کا کام سب سے مفصل اور ضخیم ہے۔ ان کی کتاب مشکل الآثار آج پوری تو دستیاب نہیں ہے، دستیاب حصے کا تحقیق وتخریج کے ساتھ مطبوعہ نسخہ سولہ جلدوں میں ہے۔ امام طحاوی کے بعد اس موضوع پر اتنا ضخیم کام شاید کوئی اور نہیں کر پایا۔ امام شافعی کی اختلاف الحدیث میں فقہی رنگ غالب تھا، یہی بات طحاوی کی شرح معانی الآثار میں ہے، لیکن ابن قتیبہ کے کام اور طحاوی کی مشکل الآثار نے اس فن کو فقہ الحدیث سے الگ ایک تشخص دے دیا۔ تشریح وتوضیح حدیث کے سلسلے کے اولین لوگوں میں مذکورہ ناموں کے علاوہ ابن حبان (م:۳۵۴ھ) اور معروف شافعی فقیہ ابوعبداللہ الحلیمی (م:۴۰۳ھ) کا نام خاص طور پر لیا جا سکتا ہے۔ مؤخر الذکر کے اقوال کی خوشہ چینی بعد کے تقریباً تمام شارحین حدیث نے کی ہے۔ امام بیہقی کتاب ''شعب الإیمان'' کی بنیاد ہی ابوعبداللہ الحلیمی کی کتاب ہے۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جمع وتدوین حدیث کا کام جب کچھ سفر طے کر چکا تو دوسری نوعیت کا کام یعنی حدیث کے معنوی پہلو پر کام بھی شروع ہو گیا۔ درمیان میں کئی صدیاں نقل در نقل یا تہذیب وتلخیص کی بھی گزریں۔ پھر جمود کا دور آیا، لیکن اب کچھ عرصے سے حدیث اور علوم حدیث پر کام کو دوبارہ اٹھان مل رہی ہے، بالخصوص عرب دنیا میں کافی کام ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ اس نشأۃ ثانیہ میں بھی ترتیب قرون اولیٰ والی نظر آ رہی ہے۔ اب تک جو کام ہوا ہے، اس میں جمع وترتیب، حدیث کو سہل التناول بنانا، اسنادی نقطۂ نظر سے بحث وغیرہ شامل ہے۔ کئی کتب حدیث جو زاویۂ خمول میں تھیں، جدید انداز کی تحقیق وتعلیق اور فہارس کے ساتھ مارکیٹ میں آ گئی ہیں اور آ رہی ہیں۔ پہلے سے متداول کئی کتب نئی فہارس کے ساتھ آ گئی ہیں، رجال پر اور رجال کی کتابوں پر خاصا کام ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا کمپیوٹر کے حوالے سے عرب دنیا میں ایسے ایسے کام ہو چکے اور ہو رہے ہیں کہ جن سے طلبہ وباحثین کے ہاتھ اس علم کی وسیع دنیا کی چابی آ گئی ہے، لیکن جس نوعیت کا کام امام شافعی، ابن جریر طبری (تہذیب الآثار میں)، ابن قتیبہ، طحاوی اور حلیمی وغیرہ حضرات سے ہوا تھا، اس پر ابھی زیادہ پیش رفت نہیں ہوئی۔ شاید اللہ تعالیٰ کو یہی منظور ہو کہ پہلی نوعیت کے کام کے ایک خاص مرحلے تک پہنچنے اور مواد تک رسائی آسان ہو جانے کے بعد ہی دوسری نوعیت کا کام شروع ہو، اس لیے کہ اس کام کے لیے جس طرح ذہن وفکر میں عمق اور گہرائی کی ضرورت ہے، وہیں وسعتِ نظر کی بھی، بالخصوص حدیث کے تمام طرق کو ایک خاص انداز سے جمع کر کے دیکھنے کی، جس کا ذکر پہلے کمپیوٹر کی افادیت کے سلسلے میں ہو چکا ہے۔

یہ بات میں اس لیے بھی عرض کر رہا ہوں کہ مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ شاید یہ کام برصغیر سے لیں۔ ایک تو اس لیے کہ یہاں بھی خدمتِ حدیث کی ایک روایت موجود ہے۔ فواد عبدالباقی کا 'مفتاح کنوز السنۃ' کے مقدمے میں یہ بیان تو مشہور ومعروف ہے کہ اگر اس زمانے میں علمائے ہند کی علوم حدیث کی طرف توجہ نہ ہوتی تو بلادِ مشرق سے ان علوم کا خاتمہ ہو چکا ہوتا۔ اسی طرح اپریل ۲۰۰۳ء میں کلیۃ الدراسات الاسلامیۃ والعربیۃ دبی کی طرف سے علومِ حدیث پر ہونے والی ایک کانفرنس میں ڈاکٹر صالح یوسف معتوق نے اپنے مقالے کے شروع میں جہاں چودھویں صدی ہجری کے دوران علومِ

حدیث سے لاتوجہی کا شکوہ کیا ہے، وہیں علماے برصغیر کا استثنا کرتے ہوئے کہا ہے:

يُستثنى من ذلك بلاد الهند، فقد ظهر فى القرون الثلاثة الأخيرة فيها نهضةٌ نشِطة فى مجال علوم السنة وشروحها، وظهر فيها أعلامٌ كبار صنفوا كتبا جليلة تدل على علوّ كعبهم ورسوخ قدمهم فيها۔

دکتور صالح یوسف جس دور کی بات کر رہے ہیں، اس میں برصغیر کے اندر کچھ تو اس نوعیت کا کام سامنے آیا جس میں سابقہ شارحین ومحدثین سے بہترین انتخاب کر کے اسے عمدہ انداز سے جمع کر دیا جائے۔ اس کی ایک بہت اچھی مثال کے طور پر مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری کی شرح ترمذی ''تحفۃ الأحوذی'' کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ ترمذی کی ایسی مکمل شرح ہے جس سے پوری دنیا میں شاید سب سے زیادہ استفادہ کیا جا رہا ہے۔ حسنِ انتخاب، حسنِ ترتیب اور حسنِ عرض اس کی اہم خصوصیات ہیں جو اکثر مقامات پر نظر آتی ہیں۔ دوسری نوعیت کا کام وہ ہے جو مجتہدانہ انداز کا ہے۔ اس میں شاہ ولی اللہ، مولانا رشید احمد گنگوہی، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا انور شاہ کشمیری اور مولانا شبیر احمد عثمانی جیسے نام بطورِ مثال پیش کیے جا سکتے ہیں۔ ان میں بیشتر کا کام اگرچہ ذرا غیر منضبط سا ہے، لیکن اس میں حلّ حدیث، رفعِ تعارض اور رفعِ اشکال واغلاق وغیرہ کے سلسلے میں نئی جہتیں دریافت کی گئی ہیں اور بہت سے مقامات پر جہاں اب تک شارحینِ حدیث پہنچے تھے، بات کو وہاں سے آگے بڑھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ برّصغیر میں عمق اور گہرائی اور حدیث کے معنوی پہلو سے زیادہ دلچسپی کی روایت کی وجہ سے ہونا یہی چاہیے کہ معنوی پہلو پر جس کام کی یہاں بات ہو رہی ہے، وہ برّصغیر میں انجام پائے، لیکن اس کے ساتھ ناامیدی کا یہ پہلو بھی سامنے آتا ہے کہ ہمارے ہاں اس علم کے ساتھ بے اعتنائی سی ہونے لگی ہے اور اس مبارک علم کے وسیع تر امکانات نظر انداز ہو رہے ہیں۔

عصرِ حاضر میں مشکل الحدیث سمیت حدیث کے معنوی پہلو پر کام کو آگے بڑھانے کی ضرورت بھی بڑھ گئی بلکہ چیلنج کی شکل اختیار کر گئی ہے اور اس کام کے لیے آسانیاں اور امکانات بھی زیادہ ہو گئے ہیں۔ ضرورت تو اس لیے بڑھ گئی ہے کہ نظامِ کائنات سے متعلق احادیث میں جن موضوعات پر بات کی گئی ہے، ان میں سے کئی چیزوں کے بارے میں گزشتہ زمانوں میں بیشتر طبعی علوم یا تو خاموش تھے یا ان کے پیش کردہ نظریات محض تخمینوں پر مبنی تھے، اس لیے ان نظریات کو بجا طور پر علمی اعتبار سے غیر ثابت شدہ قرار دے دیا جاتا تھا۔ اب ان میں سے کئی امور پر جدید سائنس نے نہ صرف سکوت توڑا ہے بلکہ محض تخمینوں کی بجائے تجربے اور استقرا پر مبنی نظریات پیش کر دیے ہیں۔ اب گویا ان میں سے کئی امور عقلی ثبوت کے اس درجے تک پہنچ چکے ہیں جس سے نقلِ صحیح کا تعارض نہیں ہو سکتا۔ اب احادیث مبارکہ میں دی گئی معلومات اور ان سائنسی نظریات کا تقابلی مطالعہ ضروری ہو گیا ہے۔ اب ان نظریات کو غیر ثابت شدہ کہہ کر نہ ماننے والی بات چلنے والی نہیں۔ اسی طرح سوشل سائنسز میں اب عقلی اعتبار سے مجرد عقلی مقدمات ملانے کو کافی نہیں سمجھا جاتا بلکہ اکثر باتوں کو ان کے نتائج وآثار کے حوالے سے پرکھا جاتا ہے، اور آثار ونتائج پرکھنے کے لیے خالص اندازوں اور تخمینوں کی بجائے شماریاتی طریقوں پر بھی انحصار کیا جاتا ہے۔

معنوی پہلو کے اس کام کے امکانات بڑھنے اور آسانیاں پیدا ہونے کا سب سے پہلا مظہر تو یہ ہے کہ اس نوعیت کے کام کی سب سے پہلی سیڑھی ہر ہر حدیث کے تمام طرق وروایات کو یکجا کرنا اور اسی موضوع پر دیگر روایات کو جمع کرنا ہے۔ اس کام کے لیے آج کے دور نے بڑی سہولتیں پیدا کر دی ہیں۔ اس آسانی کا دوسرا مظہر یہ ہے کہ پہلے بہت سی احادیث

ایسی تھیں جنہیں حل کرنے کے لیے مروّجہ طبعی علوم سے کوئی مدد نہیں ملتی تھی جبکہ آج سائنس کے مختلف شعبوں میں نئی دریافتوں، تحقیقات اور ایجادات نے بہت سی احادیث کو سمجھنا آسان کر دیا ہے، اس لیے کہ کئی جگہوں پر آج کی سائنسی تحقیق کے نتائج وہی باتیں ہیں جو چودہ صدیاں پہلے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دی تھیں۔

اس کی ایک معروف مثال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ ارشادات ہیں جن میں بخار کو ایک حرارت قرار دے کر اس کا علاج پانی بتایا گیا ہے۔ اس دور کی طب کے لیے یہ بات بڑی عجیب وغریب تھی۔ بعض لوگوں نے تو اس دور کی طب کی بنیاد پر نعوذ باللہ اس حدیث پر اعتراضات بھی کیے۔ محدثین کے ہاں بھی اس حدیث کی تشریح کے حوالے سے کئی سوالات زیرِ بحث آئے، مثلاً یہ کہ پانی سے بخار کو ٹھنڈا کرنے کی یہ بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر پانی کے بارے میں فرما رہے ہیں یا صرف آبِ زم زم کے بارے میں، اس لیے کہ بعض روایات میں زم زم کا ذکر بھی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جہاں آپ نے زم زم کا ذکر فرمایا، آیا وہ صرف اس لیے تھا کہ اس وقت آپ مکہ مکرمہ میں بات فرما رہے تھے اور اہلِ مکہ کے لیے سب سے آسانی سے دستیاب ہونے والا پانی یہی تھا۔ برکت کا پہلو اضافی تھا اور آپ کا اصل مقصد عمومی طور پر پانی کا یہ طبی اثر بیان کرنا تھا، یا آپ کے اس ارشاد کا تعلق ہی محض برکت کے پہلو سے ہے، طبی علاج بیان کرنا آپ کا مقصد ہی نہیں تھا، اس لیے آپ کا یہ ارشاد صرف زم زم کے بارے میں ہے، باقی پانیوں پر اس کا اطلاق درست نہیں ہے۔ شارحینِ حدیث کے ہاں دونوں نقطۂ نظر پائے جاتے ہیں۔ (فتح الباری، کتاب الطب: باب الحمی من فیح جہنم) اسی طرح ایک صحابیہ اور صدیقِ اکبر کی صاحب زادی اسماء سے اس پر عمل کی یہ شکل نقل کی گئی ہے کہ وہ مریض پر پانی کے چھینٹے مارا کرتی تھیں۔ اس بنیاد پر بھی یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ بخار کا پانی سے علاج ایک طبی مسئلہ ہے یا ''النشرۃ'' اور عملیات ومنتر قبیل کی کوئی چیز ہے۔ بعض حضرات نے اسے ''النشرۃ'' کی ایک جائز شکل قرار دیا ہے۔ (حوالہ بالا)

دونوں سوالوں کا جائزہ لینے کے لیے سب سے پہلا کام تو کرنے کا ہے کہ حدیث کے تمام سیاقات اور الفاظ کو سامنے رکھا جائے۔ محدثانہ انداز کے اس عمل کے نتیجے میں بھی یہی بات درست معلوم ہوتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر پانی کے بارے میں یہ بات فرما رہے ہیں اور ظاہری اسباب کے نظام اور طب کے حوالے سے ہی یہ بات فرما رہے ہیں۔ اس محدثانہ بحث کی تفصیل کا تو یہ موقع نہیں ہے۔ اصل مقصد یہ عرض کرنا ہے کہ حدیث کی تشریح میں جو مختلف احتمالات تھے، ایک محدثانہ بحث جس احتمال کی طرف جاتی دکھائی دیتی ہے، جدید میڈیکل سائنس بھی یہی کہتی ہے اور اب طبی طور پر تسلیم شدہ ہے کہ مریض کا درجۂ حرارت کم کرنے کا اہم ترین ذریعہ پانی ہے۔ اس طرح سے حدیث کے معنوی پہلو پر کام کے سلسلے میں جدید سائنس بھی ہماری مدد کر سکتی ہے۔

اسی کی ایک اور مثال میں یہ عرض کروں گا کہ متعدد صحابہ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ بچہ کبھی اپنے باپ پر جاتا ہے اور کبھی ماں پر، اس کی وجہ کیا ہے؟ یہ بھی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک کے مروجہ علم بالخصوص جزیرۂ عرب میں مروجہ علم کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا، اس لیے متعدد یہودی علما نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوچ کر یہ سوال کیا کہ اس کا جواب کوئی نبی ہی دے سکتا ہے۔ آپ نے اس کے جواب میں جو بات ارشاد فرمائی، وہ کچھ اس طرح ہے: "إذا سبق ماء الرجل ماء المرأة نزع الولد إليه وإذا سبق ماء المرأة ماء الرجل نزع الولد إليها"۔ ان لوگوں کے لیے یہ بات نئی تھی کہ مردوں کے علاوہ عورت کا بھی کوئی ایسا جز ہوتا ہے جو

استقرارِ حمل میں کردار کرتا ہے۔ عام طور پر سمجھا یہی جاتا تھا کہ عورت کا کردار محض یہ ہے کہ اس کا رحم بچے کی نشو ونما اور تخلیق کا محل ہے، استقرارِ حمل صرف مرد کے نطفہ سے ہوتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تو یہ بات متعارف کروائی کہ عورت کا بھی جزوِ تولید ہوتا ہے اور استقرارِ حمل میں مرد کے مادۂ تولید کی طرح اس کا بھی کردار ہوتا ہے۔ (گویا عورت کا کردار جز ہونے کا بھی ہے اور محلِ تخلیق ہونے کا بھی، ماں کا حق باپ سے زیادہ ہونے کی شاید ایک وجہ یہ بھی ہو) دوسری بات اس حدیث میں یہ کہی گئی کہ مرد وعورت میں سے جس کا جزوِ تولید سبقت حاصل کر لے، بچہ اس کی طرف جاتا ہے۔ مذکورہ روایت میں اس سلسلے میں سبقت کے لفظ ہیں، جب کہ اسی طرح کی حدیثوں میں آنحضرت سے ''علوّ'' کے لفظ بھی مروی ہیں، یعنی جس کا جزوِ تولید غالب آ جائے، بچہ اس کی طرف جاتا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے قرطبی سے نقل کیا ہے کہ جن روایات میں ''علوّ'' کا لفظ ہے، وہاں بھی مراد غالب آنا نہیں بلکہ سبقت یعنی پہلے آنا ہے۔ بظاہر اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس دور میں ان دونوں میں سے کسی کے غلبے کا تصور ممکن نہیں تھا۔ یہ بات البتہ سوچی جا سکتی تھی کسی کا مادۂ تولید کسی خاص جگہ پر پہلے پہنچ جائے اور کسی کا بعد میں۔ اسی کو وہ سبقت کا مصداق سمجھ رہے ہیں۔ ابن حجر کی گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ غلبے کا تصور صرف یہی ہو سکتا تھا کہ کسی کے مادۂ تولید کی مقدار زیادہ ہو۔ اگر اس حوالے سے روایات کو دیکھیں تو اس مضمون کی حدیثیں سرسری تلاش کے نتیجے میں پانچ صحابہ سے مروی ہیں: اَنس، ثوبان، عائشہ، ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم۔ ان میں سے حضرت انس کی روایتیں دو طرح کی ہیں اور دونوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الگ الگ موقعوں کے ارشادات ہیں۔ ایک میں وہی سبقت کے لفظ ہیں جو اوپر گزرے، جبکہ دوسری روایت حضرت انس سے قتادہ روایت کر رہے ہیں اور قتادہ سے سعید بن اَبی عروبہ۔ سعید کو شک ہے کہ ''سبق'' کے لفظ ہیں یا ''علا'' کے۔ اس کے علاوہ باقی چاروں صحابہ کی روایات میں ''علوّ'' کے لفظ ہیں۔ اب قرطبی نے جو سبقت کے لفظوں کو اصل قرار دیا اور علو کے لفظوں کو اس کے تابع قرار دیا، ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ یہ بخاری کے لفظ ہیں، لیکن اس کے علاوہ قرطبی کے اس قول کو اختیار کرنے کی یہ وجہ بھی قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے کہ اس دور میں ''ماء الرجل'' یا ''ماء المرأۃ'' کے غلبے اور علوّ کا تصور بہت مشکل تھا، جبکہ مجموعی روایات سے پتا چلتا ہے کہ ''علوّ'' کے الفاظ نظر انداز کیے جانے کے قابل نہیں ہیں۔ آج جدید علم الأجنۃ (Embryology) اور علم المورثات (Heredity) یا جینیات (Genetics) کے علم کی روشنی میں دیکھیں تو ایک طرف تو یہ نظر آئے گا کہ ان حدیثوں میں صداقتوں کی ایک دنیا چھپی ہوئی ہے، اور یہ حدیثیں جس طرح عبد اللہ بن سلام جیسے یہودی علما کے لیے آپ کی نبوت کی دلیل تھیں، آج بھی آپ کا معجزہ ہیں۔ دوسری طرف سے یہ نظر آئے گا کہ مرد وعورت میں سے دونوں کے کروموسمز میں موجود جین نئے بچے کی خصوصیات کا فیصلہ کرتے ہیں۔ اس عمل میں ان میں پائی جانے والی خصوصیات میں تفاوت ہونے کی صورت میں بعض بروئے کار آ جاتے اور مؤثر ہوتے ہیں، یہی ان کا ''علوّ'' ہے۔ مثلاً ایک کے جینز میں قد لمبا ہونے کی خصوصیت ہے اور دوسرے میں چھوٹا ہونے کی، تو ایک جین ایکٹو (active) اور بروئے کار ہوگا اور دوسرا موجود تو رہے گا لیکن غیر مؤثر۔ اگلی کسی نسل میں وہ مؤثر ہو جائے گا اور دوسرا غیر مؤثر۔ (اسی کو ایک حدیث مبارک میں ''لعل عرقا نزعہ'' کے لفظوں سے تعبیر کیا گیا ہے) اس لیے ''علوّ'' کے الفاظ والی روایات کو دوسری روایات کے تابع کرنے کی ضرورت جو بعض قدیم شارحین نے محسوس کی تھی، اس کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ حدیث کے ان لفظوں کو اپنے ظاہر پر ہی رکھا جانا چاہیے، اس لیے کہ اب ثابت ہو چکا ہے کہ بچے میں باپ والی خصوصیات ہوں یا ماں والی،

اس میں ’’علوّ‘‘ کا بھی کردار ہے۔ جب حدیث کے الفاظ ہو بہو امرِ واقعہ پر منطبق ہو رہے ہیں تو ان کی توجیہ یا انہیں اپنے ظاہر سے ہٹانے کی ضرورت ختم ہو جاتی ہے۔ البتہ حافظ ابنِ حجر نے یہاں ایک بڑا اہم نکتہ یہ اٹھایا ہے کہ سوال یہاں دراصل دو ہیں۔ ایک یہ کہ بچے کے اپنے ددھیال یا ننھیال کے مشابہ ہونے کی وجہ کیا ہے، دوسرا یہ کہ بچے کے مذکر یا مؤنث ہونے کی وجہ کیا ہے۔ ابنِ حجر کی یہ بات اس لیے اہم ہے کہ بعض احادیث کے سیاق سے اول الذکر سوال زیرِ بحث معلوم ہوتا ہے اور بعض سے مؤخر الذکر۔ ابنِ حجر نے یہ بھی بڑی اہم بات کہی ہے کہ مذکر و مؤنث ہونے کے معاملے سے متعلق ’’سبقت‘‘ کے الفاظ ہیں، اور جہاں مشابہت کا سوال ہے، وہاں ’’علوّ‘‘ کو اپنے معنی پر ہی رکھا جانا چاہیے۔ اب یہاں سے ہمارے لیے غور کا ایک اور دروازہ کھلتا ہے، وہ یہ کہ ماء الرجل اور ماء المرأۃ سے کیا مراد ہے؟ تو ممکنہ طور پر اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ماء المرأۃ سے عورت کا جزوِ تولید یعنی اس کا بیضہ اور ماء الرجل سے مراد مرد کا جزوِ تولید یعنی جرثومہ ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ ماء المرأۃ کے معنی ہیں بچی کی پیدائش کا باعث بننے والا کروموسوم یعنی Y Choromosome اور ماء الرجل کے معنی ہیں لڑکے کا باعث بننے والا کروموسوم یعنی X Choromsome، اور اس معاملے کا تعلق صرف مرد کے کروموسومز سے ہوتا ہے، اس لیے کہ یہ دو قسم کے کروموسوم صرف مرد کے مادۂ تولید میں ہوتے ہیں۔ مرد کے بے شمار کروموسوم بیضہ سے ملنے کے لیے دوڑتے ہیں، ان مختلف کروموسومز میں جو آگے نکل کر بیضہ کے ساتھ ملاپ کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے، نتیجہ اس کے مطابق ہوتا ہے اور یہی اس کی پہل اور سبقت ہے، البتہ بچے کے ماں یا باپ کے مشابہ ہونے یعنی ماں یا باپ والی خصوصیات کا حامل ہونے میں ماء الرجل اور ماء المرأۃ کے پہلے معنی مراد ہیں، یعنی عورت اور مرد کا جزو تولید، اور ’’علوّ‘‘ سے مراد بعض جین کا موثر اور بروے کار ہونا ہے، لہٰذا حافظ کی یہ بات بڑی وزنی ہے کہ سبقت اور علو دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ درست ہیں۔

اسی سلسلے میں ایک مثال یہ بھی پیش کی جا سکتی ہے کہ بعض احادیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بعض ایسے مناظر کو دیکھنا منقول ہے جو صدیوں پہلے ہو چکے ہیں، مثلاً حضرت یونس علیہ السلام کا خاص قسم کی اونٹنی پر خاص حالت میں تلبیہ پڑھتے ہوئے ایک جگہ سے گزرنا، اسی طرح کا معاملہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں دیکھنا۔ بعض لوگوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت یا دوزخ میں دیکھا۔ آپ نے جنت میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے قدموں کی آہٹ سنی، آپ نے امّ سُلیم کو جنت میں دیکھا۔ جو واقعات صدیوں پہلے ہو چکے، انہیں آپ نے کیسے دیکھ لیا؟ اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ جو واقعہ ابھی ہوا ہی نہیں بلکہ اسے مستقبل میں ہونا ہے، وہ آپ نے کیسے دیکھ لیا؟ اس کی محدّثین نے مختلف توجیہات کی ہیں۔ صوفیہ نے اس طرح کی احادیث کے حل اور مختلف سوالوں کے جواب کے لیے صور مثالیہ یا اجسادِ مثالیہ کا تصور پیش کیا۔ آج آڈیو اور ویڈیو ریکارڈنگ کی ایجاد نے یہ سب کچھ سمجھنا بہت آسان کر دیا ہے۔ قرآن وحدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنے والے تمام واقعات لوحِ محفوظ اور ام الکتاب (The Mother Disk or Unaccesible Disk) میں لکھوا رکھے ہیں۔ پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ لکھنے کا تعلق صرف نص (text) سے ہوتا ہے اور لوحِ محفوظ میں آنے والے واقعات صرف عبارت کی شکل میں لکھے ہوئے ہوں گے، لیکن یہ بات بھی عین ممکن ہے کہ لوحِ محفوظ کا یہ ریکارڈ عبارت کے علاوہ سمعی و بصری یعنی آڈیو ویڈیو شکل میں بھی ہو، چنانچہ آج کل کمپیوٹر کی زبان میں ان سب چیزں کے لیے write کرنے کا لفظ بولا جاتا ہے۔ انسان تو صرف ہو چکے واقعات کی آڈیو ویڈیو ریکارڈنگ محفوظ کر

سکتا ہے، لیکن کیا بعید کہ اللہ تعالیٰ کے پاس لوح محفوظ وغیرہ میں آئندہ ہونے والے واقعات کی بھی مکمل آڈیو ویڈیو وغیرہ محفوظ ہوں۔ اس تک اگرچہ کسی کی رسائی ممکن نہیں، لیکن جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ چاہیں، اسے ان واقعات میں سے بعض کے کچھ کلپس دکھا سکتے ہیں۔ عالم الغيب فلا يظهر على غيبه أحدا ، إلا من ارتضى من رسول فإنه يسلك من بين يديه و من خلفه رصدا (الجن:۲۶،۲۷) ہوسکتا ہے کہ صوفیہ کا اجسادِ مثالیہ کا تصور اسی طرح کے کسی معاملے سے تعلق رکھتا ہو، واللہ اعلم بالصواب۔ اس طرح کے موضوعات پر رابطۃ العالم الاسلامی کی ذیلی تنظیم ہیئۃ الاعجاز العلمی فی القرآن والسنۃ نے عربی اور انگریزی زبانوں میں کافی کام کرایا ہے جو کتابی شکل میں بھی دستیاب ہے اور انٹرنیٹ پر بھی۔ حدیث کے طلبہ اور متخصصین کو اس سے استفادہ کرنا چاہیے۔

بخار کے علاج، جنین والی احادیث اور عالمِ غیب کے ان مشاہدات والی احادیث کی مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ احادیث کے تمام طرق و روایات کو جمع کرنے اور دیگر علوم سے استفادے کے ذریعے حلِ حدیث یا حدیث کے معنوی پہلو پر کام کرنے میں کس طرح مدد مل سکتی ہے۔ یہ بات صرف طبعی علوم کے ساتھ، جنہیں عرفِ عام میں سائنس کہا جاتا ہے، مخصوص نہیں ہے، بلکہ دیگر متعدد علوم کا بھی یہی حال ہے۔ مثال کے طور جن احادیث میں پیشین گوئی کے طور پر دیگر اقوام کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات کے بارے میں بات ہوئی ہے، ان کو سمجھنے کے لیے تاریخ اور جغرافیہ کا اتنا علم ضروری ہے جن سے ان اقوام کے بارے میں ضروری معلومات حاصل ہو سکیں۔ قربِ قیامت کے بارے میں احادیث میں ''روم'' کا تذکرہ بہت کثرت سے ملتا ہے، جبکہ اس وقت روم نام کی کوئی طاقت دنیا میں موجود نہیں ہے۔ جو رومی سلطنت تھی، اس کے مشرقی اور مغربی حصے دونوں کبھی کے ختم ہو چکے۔ اب قربِ قیامت میں ''روم'' کی ممکنہ صورت کیا ہو سکتی ہے، نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عربوں کے ہاں ''روم'' کن کو کہا جاتا تھا، یہ جاننے کے لیے رومی تاریخ سے موٹی موٹی واقفیت ضروری ہے۔ اس کے مختلف ادوار کیا تھے، مغربی اور مشرقی حصوں میں تقسیم، عیسائیت اور رومیت کا ملاپ اور اس کے اثرات، مغربی رومی سلطنت کا خاتمہ اور شارلیمین (Charlemagne 742-814) اور اوتو (Otto 912-973) وغیرہ کے ہاتھوں اس کے احیا کی کوششیں اور ان کے کوششوں کے محرکات، مشرقی رومی سلطنت (بیزنطینی سلطنت) کا خاتمہ وغیرہ، اس طرح کی چیزوں سے واقفیت ان احادیث کے سمجھنے میں کافی مددگار ہو سکتی ہے۔

﴿۶﴾

فہمِ حدیث کے سلسلے میں ایک اہم مسئلہ بعض تعبیرات کے اجمال کا ہوتا ہے۔ اس کے پیشِ نظر نہ رہنے کی وجہ سے بعض اوقات فہمِ حدیث میں کافی مشکل پیش آتی ہے۔ ویسے تو اس اصول کی ضرورت ہر زمانے میں رہی ہے، لیکن عصرِ حاضر میں حدیث پر کام کرتے ہوئے اس کا پیشِ نظر رہنا بہت ضروری ہے، جیسا کہ آگے ذکر کی جانے والی مثالوں سے واضح ہوگا۔

بات درحقیقت یہ ہے کہ انسان کا دماغ اپنے محسوسات اور مشاہدات کا اسیر ہوتا ہے، اسی کے مطابق کسی دور کے محاورات جنم لیتے ہیں، اور انسان کو اس کے مشاہدے سے ماورا کسی چیز کے بارے میں بتانا ہو تو بھی اس کے مشاہدات ومحسوسات اور اس کے محاورے کا ہی سہارا لینا پڑتا ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ متکلم کے پیشِ نظر کوئی ایسی حقیقت ہوتی ہے جو کم از کم تا حال اس کے مخاطب کے سامنے نہیں ہوتی، بلکہ اس کی محسوس اور مشاہد دنیا سے بہت ماورا ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں متکلم کے لیے ابلاغ ایک مسئلہ ہوتا ہے۔ یہ مسئلہ ضروری نہیں کہ متکلم کی ابلاغی صلاحیت کی کمزوری سے پیدا ہو،

بلکہ عین ممکن ہے کہ متکلم تو اس کے لیے موزوں ترین تعبیرات پر قادر ہو، لیکن وہ تعبیر مخاطبین کے لیے سودمند نہ ہو۔ ایسے موقع پر یا تو مجاز کا سہارا لینا پڑتا ہے اور اس حقیقت کے مشابہ ترین چیز کسی کا استعارہ اختیار کر لیا جاتا ہے، یا اس میں کسی قدر اجمال باقی رہنے دیا جاتا ہے جس کا بیان خود واقعہ یا کسی زمانے کی معلومات کی ترقی سے ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کسی ٹھیٹھ حقیقت کے اظہار اور محاورے میں تعارض کی صورت میں اگر اس حقیقت کا بیان بذاتِ خود مقصود نہ ہو یا اصولیین کی اصطلاح میں اس حقیقت کا بیان ''ماسیق لہ الکلام'' نہ ہو تو ایسی صورت میں محاورے کے پہلو کو ترجیح دی جاتی ہے تاکہ اصل مقصود کا ابلاغ درست طریقے سے ہو سکے۔ نصوص میں اس کی بیسیوں مثالیں ملتی ہیں۔

کسی زمانے میں یہ بحث چلتی رہی ہے کہ انسان کی عقل اور اس کی سمجھ بوجھ کا تعلق دل سے ہے یا دماغ سے۔ مسلمان مفکرین میں بھی یہ مسئلہ زیرِ بحث رہا ہے۔ کئی حضراتِ متکلمین نے اسے دل کا کام قرار دیا ہے، جبکہ جدید کی طرح قدیم اطبا اسے دماغ کا وظیفہ قرار دیتے تھے۔ امام ابو حنیفہ سے بھی یہ بات نقل کی گئی ہے۔ بظاہر امام صاحب نے اس مسئلے میں اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا بلکہ انہوں نے یہ محسوس کیا کہ یہ شریعت کا کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے، ایک طبی مسئلہ ہے اور جس فن کا مسئلہ ہو، اس میں اسی کے ماہرین پر اعتماد کرنا چاہیے۔ جہاں تک ان نصوص کا تعلق ہے جن میں سمجھنے اور غور کرنے کی نسبت دل کی طرف کی گئی ہے، ان میں بنیادی طور پر تعبیر کا وہی اصول کارفرما ہے جس کا ابھی ذکر ہوا۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی بھی نہیں کہے گا کہ نصوص کا مقصودِ اصلی بطور عضو دل کا وظیفہ بیان کرنا ہے۔ اصل مقصود غور و فکر کی صلاحیت کو استعمال کرنے کی دعوت دینا ہے، عضو اس کے لیے جو بھی استعمال ہو۔ محاورے میں چونکہ ایسے موقع پر دل ہی کی طرف نسبت کی جاتی تھی، اس لیے اسی محاورے کو اصل مقصود کے ابلاغ کے لیے استعمال کر لیا گیا، اور اس بات کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی کہ پہلے محاورے کی اصلاح کر کے اصل مقصود سے توجہ ہٹائی جائے۔ میں اس کی یہ مثال دیا کرتا ہوں کہ جدید سائنس میں طے شدہ ہے کہ سوچنے سمجھنے کی طرح انسانی جذبات کا محل بھی دماغ ہی ہوتا ہے۔ اب سائنس کا ایک استاد جو اپنے طلبہ کو دلیلوں سے سمجھاتا ہے کہ یہ سب کچھ دماغ سے ہوتا ہے، اس کے جذبات کو کسی سے ٹھیس پہنچے تو وہ کبھی یہ نہیں کہے گا کہ تمہارے اس طرزِ عمل سے میرا دماغ دُکھا ہے، وہ یہی کہے گا میرا دل دُکھا ہے۔ وہ یہ تو کہے گا کہ میرا دل ٹوٹا ہے، یہ نہیں کہے کہ دماغ ٹوٹا ہے۔ بیگم کا پکایا ہوا کھانا اگر پسند نہیں ہے تو یہ کہے گا میرا اسے کھانے کو دل نہیں چاہ رہا، یہ نہیں کرے گا کہ پہلے لیکچر دے کر اسے سمجھائے کہ چاہنے کا تعلق دل سے نہیں دماغ سے ہوتا ہے، پھر اسے یہ بتائے کہ فلاں چیز کھانے کو میرا دماغ چاہ رہا ہے اور فلاں کو نہیں چاہ رہا۔

دجال کی احادیث میں اس کے گدھے کا ذکر ہے کہ وہ غیر معمولی بڑا ہوگا، اس کی رفتار بھی غیر معمولی ہوگی، خاص طور پر اس کے کانوں کے بارے میں آتا ہے کہ وہ بہت بڑے ہوں گے۔ یہاں پر بھی تعبیر کے اسی مسئلے کا انطباق ممکن ہے۔ ہو سکتا ہے وہ گدھا ہی ہو لیکن خرقِ عادت طور پر اتنا بڑا ہو، ہو سکتا ہے کہ اس وقت تک جینیٹک انجینئرنگ اتنی ترقی کر جائے کہ اتنے بڑے بڑے گدھے پیدا ہونے لگیں، ہو سکتا ہے گدھے سے مراد جہاز ہو، لیکن ظاہر ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر پوری حقیقت منکشف بھی ہو اور آپ کو یہ بھی معلوم ہو کہ اس زمانے میں اسے ہوائی جہاز کہا جائے گا یا کوئی نام ہوگا، تب بھی آپ اگر یہ لفظ بولتے تو عصر حاضر تک بلکہ شاید دجال کے زمانے تک وہ لفظ ''متشابہات'' میں سے رہتا۔

اسی اصول کا اطلاق نظامِ کائنات سے متعلق کئی احادیث پر بھی ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر حدیثوں میں زمین و آسمان کا درمیانی فاصلہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ فاصلہ بعض روایات میں تقریباً ستر سال کی مسافت اور بیشتر میں پانچ سو سال کی مسافت

بیان کیا گیا ہے۔ اب اُس دور کے اعتبار سے ایک دن کی مسافت کو لیا جائے تو وہ تقریباً سولہ میل بنتی ہے، اور سال ۳۶۵ دن کا بھی لگا لیں تو ایک سال کی مسافت ۸۵۴۰ میل بنتی ہے۔ اس طرح ستر سال کی مسافت ۴۰۸۸۰۰ میل اور پانچ سو سال کی مسافت ۲۹۲۰۰۰۰ میل بنتی ہے۔ اس سے کہیں زیادہ تو سورج کی زمین سے مسافت ہے۔ یہ حساب تو اونٹوں کی رفتار سے تھا۔ اگر گھوڑوں کی رفتار سے بھی حساب لگا لیا جائے تو یہ عدد اگرچہ زیادہ ہو جائے گا، لیکن تب بھی جو عدد سامنے آئے گا، وہ آج کے خلائی علم کے لحاظ سے، جس میں فاصلوں کی پیمائش میں نوری سال بھی چھوٹے محسوس ہو رہے ہوں، کوئی بہت بڑا عدد نہیں ہوگا، اس لیے کہ ایک نوری سال ہمارے سالوں کے اعتبار سے کھربوں سال کا ہوتا ہے اور اکثر ستارے زمین سے کئی کئی نوری سال کے فاصلے پر ہیں، بلکہ کئی تو سینکڑوں، ہزاروں یا اس سے بھی زیادہ نوری سالوں کے فاصلے پر واقع ہیں، اور یہ بات بھی مشاہدے میں آ چکی ہے کہ یہ سب ستارے آسمان سے نیچے ہیں۔ ان کے راستے میں کوئی آسمان موجود نہیں ہے۔ (اسی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سفرِ معراج کی عظمت کے ایک پہلو کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اتنے مختصر وقت میں اتنا طویل فاصلہ طے فرمایا کہ ہماری گنتیاں تا حال اس کے شمار سے عاجز ہیں) اس لحاظ سے مذکورہ حسابات سے دیکھا جائے تو پانچ سو سال کی مسافت کوئی بڑی مسافت نظر نہیں آتی، یہ تو آسمانوں سے بہت نیچے پوری ہو جاتی ہے۔ بات دراصل یہاں بھی وہی ہے کہ ان احادیث کا اصل مقصود اس کائنات کی وسعت کو بیان کرنا ہے۔ اس وقت کے لحاظ یہ تعبیر بھی اس مقصد کے لیے کافی تھی۔ جہاں تک اصل پوری حقیقت کا تعلق ہے تو یہ کہنا پڑے گا کہ ان حدیثوں میں اگرچہ وہ بھی بیان ہوئی ہے اور اصل حقیقت کے اعتبار یہ تعبیرات امرِ واقعہ پر منطبق ہوتی ہیں، لیکن ہمارے اعتبار سے اس طرح کی روایات میں دو طرح کا اجمال ہے جو آج تک بھی برقرار ہے۔ ایک یہ کہ رفتار کس چیز کی؟ اونٹوں کی، گھوڑوں کی، آواز کی، روشنی کی جس سے نوری سال ناپا جاتا ہے یا کسی اور چیز کی جس سے آج کا انسان بھی ناواقف ہے؟ دوسرے یہ کہ سال تو کسی چیز کی گردش کا نام ہے، زمین کا سال اور ہے دیگر سیاروں کا اور، کہکشاؤں کے اور۔ ضروری نہیں کہ یہاں زمین کا سال ہی مراد ہو، اتنی وسیع کائنات میں نہ معلوم کون کون سے سال ہوں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پوری کائنات، جس کی وسعتوں سے آج کا انسان بھی ناواقف ہے، اس کی عمومی گردش کے اعتبار سے کوئی مجموعی سال ایسا ہو جو ابھی تک انسان کے علم میں نہ آ سکا ہو۔ آخرت کا تو ایک سال نہیں، صرف ایک دن دنیا کے پچاس ہزار سالوں کا ہوگا۔ حاصل یہ کہ پانچ سو سال کی مسافت میں سال کون سا مراد ہے اور ایک سال میں کس چیز کا مسافت طے کرنا مراد ہے، اس حوالے سے حدیث میں تا حال اجمال موجود ہے اور جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، یہ اجمال متکلم کی ابلاغی قدرت کی کمی کی وجہ سے نہیں، مخاطب کی رعایت کی وجہ سے ہے، لیکن اس اجمال کے باوجود اصل مدعا اور پیغام واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی یہ کائنات بہت بڑی اور وسیع ہے۔ عین ممکن ہے کسی زمانے میں انسان کا علم ایسی جگہ پہنچ جائے جہاں یہ اجمال یا اس اجمال کے بعض حصے باقی نہ رہیں۔